عظمتِ عمرؓ کے تابندہ نقوش
مصنف: علی الطنطاویؒ
ترجمہ: محمد اسجد قاسمی ندوی

عظمتِ عمر رضی اللہ عنہ

کے

تابندہ نقوش

مصنف

علی الطنطاوی

ترجمہ

محمد اسجد قاسمی ندوی

پیشِ لفظ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مشتاق بک کارنر الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

نام کتاب .... عظمتِ عمر رضی اللہ عنہ کے تابندہ نقوش

مؤلف .... علی الطنطاوی

مترجم .... محمد اسجد قاسمی ندوی

پروف ریڈر .... حافظ محمد ذوالفقار

نظرثانی .... حافظ عبدالخبیر اُویسی

ناشر .... مشتاق احمد

پرنٹر .... اسد نیّر پرنٹرز لاہور

قیمت .... -/75 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

(مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ)

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علٰی سید المرسلین محمد و علٰی آلہ و صحبہ أجمعین.

خلیفۂ راشد دوم سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تاریخ اسلام بلکہ تاریخ انسانیت کی چند عظیم ترین شخصیات میں سے ہیں، اسلام کی رفعت و سربلندی کی ایمان افروز داستانیں ان کے نام کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں، ان کی عظمت و عبقریت کے بے شمار پہلو ہیں جنھیں اجاگر کرنے کی کوشش ہر دور کے مصنفین نے کی ہیں۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حیات اور کارناموں کے بارے میں مختلف زبانوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، اردو زبان میں علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''الفاروق'' بہت سی خصوصیات کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی۔

دورِ حاضر میں سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ پر لکھی گئی کتابوں میں شیخ علی طنطاوی کی کتاب ''قصة حياة عمر رضی اللہ عنہ'' بھی قابل مطالعہ ہے، شیخ علی طنطاوی عربی زبان کے صاحب اسلوب ادیب اور ممتاز داعی و مفکر ہیں ان کی تحریروں میں درد و سوز اور تاثیر ہے۔

مجھے مسرت ہے کہ نوجوان فاضل عزیزم مولوی محمد اسجد قاسمی ندوی ابن

جناب مولانا محمد باقر حسین صاحب نے شیخ علی طنطاوی کی کتاب " قصة حياة عمر رضی اللہ عنہ " کو اردو کا جامہ پہنایا ہے اور ترجمہ میں اصل کتاب کی خصوصیات کشید کرنے کی پوری کوشش کی ہے، میری دعا ہے کہ نوجوان مترجم کی یہ کوشش عنداللہ مقبول ہو اور اس ترجمہ سے اردو خواں طبقہ کو زیادہ سے زیادہ دینی و دعوتی فائدہ پہنچے۔ آمین

ابوالحسن علی حسنی ندوی
۸/صفر المظفر ۱۴۲۰ھ

مصنف کتاب

علی بن مصطفیٰ طنطاوی

شام کے صاحب طرز اور اسلامی الفکر ادیب و انشاء پرداز علی الطنطاوی ۱۳۲۷ھ میں دمشق شام میں پیدا ہوئے' ان کے والد سرکاری ملازم تھے۔ دمشق کے مشہور علماء میں شیخ ابوالخیر میدانی اور شیخ صالح تیونسی وغیرہ سے تعلیم حاصل کی' کچھ دنوں مدرسہ نظامیہ میں بھی داخل رہے' پھر سوریہ یونیورسٹی سے قانون کا کورس مکمل کر کے ڈگری حاصل کی' دارالعلوم مصر میں بھی چند ماہ قیام کیا' تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں صحافت سے منسلک رہے اور کچھ دنوں لبنان' عراق اور مصر میں عربی زبان کی تدریس کا مشغلہ رکھا' ۱۹۴۰ء میں قضاء وعدالت کے محکمہ سے متعلق ہوئے ساتھ ہی تدریس وصحافت سے بھی شغل رکھا' پھر جب شام میں ہنگامی حالات پیدا ہوئے اور علماء حق کے لئے دائرۂ حیات تنگ کر دیا گیا تو طنطاوی صاحب ہجرت کر کے حجاز میں مقیم ہوئے اور مکہ کے بعض تعلیمی اداروں میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے پھر ریڈیو اور ٹیلیویژن پر ادبی و علمی پروگرام پیش کرنے اور سوال و جواب کے مفید سلسلہ میں مصروف ہو گئے' اب جدہ میں ہیں اور مریض وصاحب فراش ہیں۔

موصوف بیسوں مستند و معتبر کتب کے مصنف ہیں' عصر حاضر کے منتخب مصنفین' باکمال فضلاء اور چیدہ ادباء میں سرفہرست ہیں' ان کی کتابیں اور مقالات قدیم وجدید کا آمیزہ ہیں اور بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ ان کی کچھ مشہور کتابوں میں ان کی خودنوشت سوانح "ذکریات" اور رجال من التاریخ ، قصص من التاریخ' صور و خواطر ، مع الناس ، ابوبکر الصدیق ، اخبار عمر ، بغداد وغیرہ ہیں۔

مقدمۂ طبع دوم

خلیفۂ دوم سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سیرت و حیات سے مجھے کافی دلچسپی رہی ہے، اسی لئے ۱۳۵۲ھ کا پورا سال میں نے اسی مطالعہ میں مصروف رکھا، مراجع و مصادر کی طلب اور زیادہ سے زیادہ تر کی جستجو میں کئی مہینے لگ گئے۔ جب کافی حد تک میں مطالعہ سے فارغ ہو چکا تو میں نے ایک مختصر سا مضمون لکھا جس میں میں نے سیرت عمری کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے اور بعض ان عظیم کارناموں کو خاص طور سے پیش کرنے پر زیادہ توجہ و محنت صرف کی جو لوگوں کی توجہ و التفات سے محروم تھے، اس مضمون کا سلسلہ میں نے ان کے اسلام لانے کے عجیب و غریب معجزاتی واقعہ سے شروع کیا، کیونکہ یہی وہ دن تھا جس میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی اصل ولادت ہوئی اور انھوں نے اسی دن کے بعد سے تاریخ کے صفحات پر انمٹ و پائیدار نقوش چھوڑے، پھر یہ مضمون میری دوسری ضخیم تالیف "**عمر بن الخطاب** رضی اللہ عنہ" کا جز بن گیا، عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نامی کتاب کی تصنیف کی ابتدائی تحریک پھر تصنیف کے بعد طباعت و نشر کی ذمہ داری میرے عزیز دوست شاعر احمد عبید رحمۃ اللہ علیہ نے لی تھی۔ بعد میں میں نے کتاب میں حذف و اضافہ اور ترمیم کی پھر دوبارہ وہ "اخبار عمر رضی اللہ عنہ" کے نام سے طبع ہوئی اور پڑھی جا رہی ہے۔ مگر یہ مضمون سرد خانہ میں پڑا رہا اور اس کی طباعت کی نوبت نہ آ سکی، کافی عرصہ بعد بتوفیق الٰہی میرے عزیز ترین فرزند محمد نادر حتاحت مالک "دار المنارۃ جدہ" نے اس کو مستقل کتاب کی حیثیت دے دی اور "**قصة حياة عمر** رضی اللہ عنہ" کے نام سے طبع کرا دیا۔

زمانہ گزرتے دیر نہیں لگتی، وقت بڑی آسانی سے گزر جاتا ہے۔ آج

یاد آتا ہے کہ یہ مضمون ۱۳۵۲ھ کے آغاز میں ماہ محرم کے وسط میں دمشق میں لکھا گیا تھا اور اب اس کا مقدمہ میں ۱۴۱۳ھ کے نصف میں مکۃ المکرمہ میں لکھ رہا ہوں۔ ان دونوں مرحلوں میں ۶۱ سال کا طویل عرصہ حائل ہے۔ وطن بدل گیا' باشندے بدل گئے' ماحول بدل گیا بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے میں خود بھی بدل گیا ہوں۔ اس مضمون کو تیار کرتے وقت میں دمشق میں عنفوان شباب میں ۲۵ سال کا تھا اور اب میں ۸۵ سال کا کمزور و ناتواں انسان ہوں' عمر عزیز کا موسم بہار ختم ہو کر موسم خریف و خزاں آ چکا ہے۔ گردش لیل و نہار نے میرے ذہن میں اس مضمون کی ذرا بھی یاد نہ چھوڑی مگر اب جب میں پریس جانے سے پہلے اس مضمون پر نظر ثانی کر رہا ہوں تو مجھے بڑا تعجب ہو رہا ہے اور یہ محسوس ہو رہا ہے جیسے میں کوئی نئی چیز دیکھ رہا ہوں۔ گویا یہ میرا مضمون نہ ہو کسی اور کا ہو' یہ اسلوب وطرز مجھے خود بیحد متاثر کر رہا ہے۔

آپ میرے اس اظہارِ پسندیدگی پر تعجب نہ فرمایئے! میری عادت تو یہ ہے کہ اپنی تخلیقات پر نظر ثانی نہیں کرتا اور اگر کرتا بھی ہوں تو مجھے وہ پسند نہیں آتیں اور نہ دل کو بھاتی ہیں لیکن آج اس مضمون کو پڑھتے وقت میرے دل و دماغ عجیب وجدانی' سرشاری و سرمستی کی کیفیت سے دوچار ہو گئے ہیں اور مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں اسی فضا میں پرواز کر رہا ہوں اور اسی زمانۂ عمر میں پہنچ چکا ہوں جسے بجا طور پر عزت و شرف' مجد و کرم' علو و سربلندی اور عروج و ارتقاء کا عہد زریں کہا جا سکتا ہے اور میری حالت ویسی ہی ہے جیسے کسی گم گشتۂ راہ و منزل اور سورج کی تمازت و تپش سے دوچار صحراء اور بے آب و گیاہ میدان میں بھٹکے ہوئے مسافر کو قحط و خشکی اور درندوں سے نکال کا سرسبز و شاداب باغ اور پھولوں' پھلوں' درختوں' سبزوں' نہروں اور دریاؤں جیسے فطری و طبعی دلآویز مناظر میں پہنچا دیا گیا ہو۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں اسی مثالی جماعت کے

زمانہ میں ہوں جس کے بارے میں میرے ماموں محب الدین الخطیب مرحوم نے کہا تھا کہ یہ وہ جماعت ہے کہ روئے زمین پر اس سے پہلے نہ کوئی ایسی جماعت آئی اور نہ آ سکے گی۔ چشم فلک نے پہلی بار یہ گروہ دیکھا اور اب شاید ایسا گروہ دیکھنے میں نہ آئے۔ مجھے خود اس بے نظیر و عظیم جماعت کی عظمت و عبقریت کا احساس ہے اور اس موضوع پر میں ہزاروں صفحات سیاہ کر چکا ہوں اور اب ان تحریروں کا اپنے مسلم معاشرہ کی بدحالی سے موازنہ کرتا ہوں تو وہ بڑی دلکش و جاذب و مؤثر نظر آتی ہیں۔

ہمارے ماضی و حال میں زمین و آسمان کا فرق آ چکا ہے اور یہ فرق روز افزوں ہے۔ ہمارا ماضی یہ تھا کہ ہمارے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہوتی تھی اور پکارنے والا یہ ندا لگاتا تھا کہ جسے ہدایت و کامرانی کی طلب ہو' جو سعادت دارین کا خواہاں ہو تو قرآن اور اس کی تعلیمات اس کے لئے بہتر راہبر و راہنما ہیں اور جو ضلالت و گمراہی کو ترجیح دیتا ہو اس کا علاج تلوار ہے۔ اسی لئے ہم دنیا کے معلّم و قائد اور راہنما حکمراں تھے۔ ہمارے قدموں پر ظالم و جابر حکمرانوں کے تخت و تاج نچھاور ہوتے تھے' ہمارے ہاتھوں ظالموں کے تختے پلٹے اور توڑے جاتے تھے' سرکش و متکبر انسان اس حق کے سامنے سرافگندہ ہو جاتے تھے' جس حق کی صدا و علم ہم بلند کرتے تھے' مگر پھر ہم بدلے' ہمارا ایمان و عمل بدلا' ہماری زندگی کا نقشہ بدلا' اور وہ مجد و شرف کھو گیا جو ہمارا ہم سایہ و ردیف رہا کرتا تھا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کی ذلیل ترین قومیں ہم پر دست درازیاں کرنے لگیں' ہم پر ظلم و ستم کرنے لگیں' ہمارے ملکوں پر حملے و قبضے شروع کر دیئے' پھر یہ ذلت و نکبت بڑھتی گئی یہاں تک کہ یورپ کی وہ پسماندہ قومیں بھی آنکھ دکھانے لگیں جو کسی لائق بھی نہ تھیں اور اپنی محدود تہذیب کو مضبوطی سے تھامے اپنے علاقے میں جاگزیں تھیں جیسے حشرات الارض اپنے سوراخوں

میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ چھپے رہتے ہیں' یہ صربی تھے۔ آپ خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ صربی کب شریف قوم تھے؟ اور ان کا قبیلہ کب زندہ ومعزز تھا؟ ان کے کون سے تاریخی مآثر ہیں؟ اور کون سا مجد وشرف ان کے پاس ہے؟ پھر کیوں وہ یہ جرأت کررہے ہیں' مسلمان مردوں کے قتل وخون اور عورتوں کی بے آبروئی اور وطن پر غارت گری وقبضہ کی کارروائیاں انجام دے رہے ہیں ؎

أيا عجبًا حتٰی کلیب تسبّنی

کأن اباها نهشل و مجاشع

''تعجب ہے کہ قبیلۂ کلیب بھی مجھے گالیاں دے رہا ہے' گویا نہشل و مجاشع جیسے معزز افراد اس کے باپ ہوں''۔

غلبہ تو اللہ' رسول اور مومنین مخلصین ہی کے لئے مقدر ہے' پھر ہم مسلمانوں کو ہر جگہ ذلت ورسوائی اور مظلومیت کا نشانہ کیوں دیکھ رہے ہیں؟ یہ کیا ہوگیا ہے کہ انھیں کوئی مددگار اور غم گسار بھی نصیب نہیں ہورہا ہے؟ خدائے ذوالجلال نے تو مسلمانوں سے مدد کا وعدہ فرمایا ہے پھر کیوں ہماری مدد نہیں فرمارہا ہے۔ جبکہ ہم ہر جمعہ کو منبروں سے یہ دعائیں مانگتے ہیں:

اللّٰهمّ أعزّ الاسلام والمسلمین.

''خدایا! اسلام اور مسلمانوں کو غلبہ وکامرانی نصیب فرما''۔

ہم کافروں اور مشرکوں کے انتشار' شیرازہ بکھرنے' جمعیت پارہ پارہ ہونے' منصوبے اور تدبیریں ناکام ومنقلب ثابت ہونے کی دعائیں کرتے ہیں۔ بس بات یہی ہے کہ ہم مشرکین کے لئے بددعا تو کرتے ہیں مگر ان کے نقشِ پا کی پیروی بھی کرتے ہیں' اپنی شریعت کے احکام سے انحراف اور کافروں کے طور وطرز کی اتباع وتقلید کرتے ہیں' ہم اپنے غلبہ کے لئے دعاگو رہتے ہیں مگر صرف دعا پر اکتفا کرکے گھروں میں بیٹھ جاتے ہیں جبکہ رسول اکرم ﷺ نے

بدر کے دن پہلے فوج تیار کی، لشکر منظم کیا، صفیں مرتب فرمائیں، اور تمام کامیابی کے ذرائع و وسائل مہیا فرمائے، پھر بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوئے اور دعائیں مانگتے رہے، یہاں تک کہ چادر مونڈھے سے گر گئی۔ دعا ایسی ہونی چاہئے۔ دیگر وسائل و تیاریوں سے بے پرواہ ہو کر صرف دعا کو سب کچھ سمجھ لینا نہ توکل ہے اور نہ ایمان کا تقاضا۔ دعا قبول اسی وقت ہوتی ہے، جب انسان تمام وسائل مہیا کرے، پھر آخر میں سجدہ ریز ہو اور دستِ دعا دراز کرے۔

اللہ رب العزۃ نے فرما دیا ہے: ﴿ ان تنصروا اللّٰہ ینصرکم ﴾ اس نے ہماری مدد کو اپنی مدد سے مربوط و مشروط فرما دیا ہے۔ پھر کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم اس کی مدد نہ کریں (احکام کی پیروی و اطاعت نہ کریں) اور وہ ہماری نصرت فرمائے؟ کیا ہم نے خوشحالی، فراخی اور فارغ البالی کے زمانہ میں اس کو یاد رکھا تھا کہ اب وہ تنگدستی اور بدحالی کے موقعہ پر ہمارا حامی و ناصر ثابت ہو؟ کیا ہم نے بوسنیا کے مظلوم اور صومال کے قحط و افلاس زدہ اور اس کرۂ ارض کے مصائب و مشاکل کے شکار ان تمام مسلمانوں کے حقوق سمجھے، جانے اور ادا کئے جو صرف کلمۂ حق کہنے کی پاداش میں مبتلائے آلام و محن اور دار و رسن کی منزلوں پر کھڑے ہیں؟ کیا ہم نے ان کے برادرانہ و ایمانی حقوق ادا کئے؟ یہی وہ اخوت و بھائی چارگی ہے جسے اللہ رب العزت نے مضبوط کیا ہے اور فرمایا ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ ﴾ کہ سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہم اپنے ان ستم رسیدہ بھائیوں کے غم میں شریک و حصہ دار اور مدد گار ہوتے مگر وہ قتل ہوتے رہے اور ہم لہو و لعب اور عیش و طرب میں منہمک رہے، ان کے وطن و دیار لوٹے جاتے رہے اور ہم عیش پرستیوں، لذت کوشیوں اور بیکاری کے کاموں میں مست رہے۔ ان کے مقدس خون کے قطروں سے زمین سینچی جاتی رہی اور انتقامی کارروائیاں پوری کی جاتی رہیں اور ہم تن

آسانیوں اور بدمستیوں کا شکار رہے۔ پھر اب کس منہ سے ہم غلبہ و مدد الٰہی کے طلبگار و مستحق ہیں؟

ہمارا کیا حال ہو گیا ہے کہ ہم غلبہ و کامرانی غیروں کے پاس ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ غلبہ اللہ' رسول اور مسلمانوں ہی کا حصہ ہے۔ ہم ان سے کیوں ڈرتے ہیں جبکہ اگر ایمان خالص ہو تو اللہ کے علاوہ کوئی اس لائق نہیں کہ اس سے ڈرا جائے۔ ان کے پاس جو کچھ ہے اور جتنی بھی طاقت و شوکت ہے اس کو فنا ہے اور اللہ کے پاس جو ہے وہ ابدی و سرمدی ہے۔ پھر ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ نہیں چاہتے جسے بقاء و دوام ہے اور اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں جسے فنا و زوال ہے' کیا ہم یہ بھول گئے کہ زمانہ تو گاڑی کے پہیہ کی طرح ہے جس کا اوپری حصہ نیچے اور نچلا حصہ اوپر ہوتا رہتا ہے؟ پھر ہم کیوں رحمتِ الٰہی اور نصرتِ ربانی سے مایوس و ناامید ہیں؟ جبکہ ہماری نگاہوں نے وہ سب دیکھ لیا جس کا ہم خیال و خواب میں تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ سب کچھ حقیقت بن کر سامنے آ چکا ہے جسے ہم محال و ناممکن سمجھا کرتے تھے۔ پھر ناامیدی و قنوطیت کیسی؟

آپ خود دیکھئے کہ مشرق کے سارے ممالک یورپ کے قبضہ کے زیر اثر تھے' یہاں تک کہ یورپ کے چھوٹے چھوٹے ممالک بھی مشرق کے چند در چند بڑے و وسیع ممالک پر قابض و مسلط تھے۔ بلجیم کانگو پر اور ہالینڈ انڈونیشیا پر قابض تھا۔ گویا مینڈک ہاتھی کو نگل رہا تھا۔

ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے کہ دنیا میں دو سپر پاور حکومتوں کا غلبہ تھا مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک طاقت نیست و نابود اور بے نام و نشان ہو گئی' دوسری طاقت گو ایک متعین مدت تک باقی رہے گی' مگر اسے اندر سے گھن لگتا جا رہا ہے' جو اسے مٹا کر ہی چھوڑے گا۔ کس کے سان و گمان میں یہ تھا کہ روسی اتحاد بالکل

ناپید و فنا ہو جائے گا؟ کون یہ مانتا تھا کہ اسے اپنے فرزندوں کے ہاتھوں ہی تباہی کا مزہ چکھنا پڑے گا؟ یا پہلے ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کو دیکھ کر کون یہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ انگریز بے اقتدار و محروم اور ہندوستانی آزاد و حکمراں ہو جائیں گے؟ مگر ایسا ہوا' انگریزوں کو جانا پڑا اور ہندوستان آزاد ہوا' روم کا سقوط و زوال عرصہ تک مورخوں کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بنا رہا لیکن روسی اتحاد کا سقوط و زوال اس سے زیادہ ہمہ گیر اور تعجب خیز ثابت ہوا' کیونکہ روسی اتحاد روم سے زیادہ وسیع' طاقتور اور موثر تھا' بلکہ اپنے دور کی یا پہلے کی ساری حکومتوں کے مقابلہ میں اسے برتری حاصل تھی۔ یہ کون مانتا تھا کہ اللہ اور روز قیامت پر ایمان نہ رکھنے والوں نے اس وقت کی سپر پاور امریکا کو زچ کر کے رکھ دیا۔ اور یہ صرف ایمان کا کرشمہ تھا۔ گو یہ ایمان اللہ پر نہیں طاغوت و باطل پر ایمان تھا۔ مگر صرف ایمان میں وہ قوت و تاثیر ہے جو غلبہ عطا کر دیتی ہے۔ یا کون یہ مانتا تھا کہ اللہ' رسل و انبیاء اور آسمانی کتابوں پر ایمان رکھنے والی نچی جماعت سوویت یونین جیسی بارعب و شوکت و جلال یونین پر غالب و حاوی ہو جائے گی؟ یا ایک نیم جان انسان جس کے سر کے سوا کچھ زندہ نہ ہو فلسطین میں حماس کے نام پر ایک مخلص' جانباز' سرفروش اور مجاہد تنظیم کے داغ بیل ڈالے گا؟ کون تسلیم کرتا تھا کہ ایسے جیالے جن کے پاس وطن کے سنگریزوں اور زورِ بازو کے سوا کچھ نہ تھا وہ اسرائیل جیسی منظم حکومت کے سامنے سینہ سپر اور محاذ آرا ہو جائیں گے؟ اسرائیلی حکومت بذاتِ خود کچھ نہیں ہے لیکن وہ اپنے مدد گار مؤیدین کے ہتھیاروں اور پیسوں کے زور پر طاقتور ثابت ہو رہی ہے۔

مسلمانوں کی تعداد بھی بدر کے روز ۳۰۰ سے کچھ ہی متجاوز تھی لیکن اس قلیل تعداد نے اسلامی لشکر کے لئے اس فتح کے سلسلہ کی بنیاد ڈالدی جس کا دائرہ تین صدیوں میں ثلث عالم تک پھیلتا چلا گیا' اور آج ان کی تعداد گو ایک ارب

سے بھی متجاوز ہے، لیکن بات دراصل وہی ہے جو نبی اکرم ﷺ نے فرمائی ہے:
ولکنکم غثاء کغثاء السیل. کہ تمہاری تعداد گو چند در چند ہو جائے گی مگر تم سیلاب کے جھاگ کی طرح ناپائیدار و بے اثر ہو گے۔ کیونکہ ہمارے اسلاف راہ خدا میں جان قربان کر دینا اتنا ہی پسند کرتے تھے جتنا ان کے دشمن زندہ رہنا اور جینا۔ پہلے حال یہ تھا کہ راہِ خدا میں مرنا ہماری قلبی تمنا اور دلی خواہش تھی اور اب یہی چیز ہم کو سب سے ناگوار گزرتی ہے، پہلے ہم یکجا و متحد ہو کر دشمن پر حملہ آور ہوتے تھے اور اب ہم باہم دست و گریباں ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ شیاطین الانس دشمن ہم پر حملہ آور ہیں۔ ہر طرف ظلمت ہی ظلمت ہے۔ کیا اس تاریکی میں اجالا بھی ہو سکے گا؟ یہ شبِ تیرہ و سیاہ ختم بھی ہو گی؟ ہاں کیوں نہیں۔ دنیا کی ہر چیز کو زوال اور فنا ہے۔ یقیناً نور ظلمت پر غالب آئے گا، صبح امید طلوع ہو گی اور ظلمتیں چھٹیں گی۔ رات اس وقت ختم ہو جاتی ہے جبکہ صبح صادق طلوع ہو جاتی ہے اور موذن فجر کی اذان شروع کرتا ہے۔ تو جب ہمارا منادی و موذن ہم میں بصدقِ قلب اذان شروع کرے گا اور ہم توجہ و خلوص سے اس پر کان دھریں گے، اس کے بولوں پر غور و فکر اور سنے ہوئے کلمات پر عمل شروع کریں گے اور ہم **اللہ اکبر لا الہ الا اللہ** کو اپنی حیاتِ مستعار کے ہر ہر لحہ کے لئے حرزِ جاں اور دستورِ زندگی سمجھ لیں گے تب ہماری صبح طلوع ہو گی، تاریکیاں مٹیں گی، ظلمت شب ختم ہو گی، مددِ الٰہی ہمارے ساتھ ہو گی اور ہمیں غلبہ نصیب ہو گا۔ کیونکہ ۔

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

محترم قارئین! جس ذات وحدہٗ لاشریک نے آپ کے آباء و اجداد کی نصرت و حمایت کی تھی وہی آپ کی بھی مدد و نصرت کرے گی۔ اگر آپ اس ہستی کی مدد و تعاون کے خواہاں ہیں تو اس کے لئے شرط یہ ہے کہ آپ اس قانون

الٰہی کی پاسداری فرمائیں جو اس نے طے فرما دیا ہے' کیونکہ خدائے ذوالجلال انھیں کی مدد کرتا ہے جو اس کے قانون شریعت کو حکم و راہنما سمجھتے ہیں' جو شعائر اسلام کو قائم و دائم رکھتے ہیں اور قضاء الٰہی سے سرِ مو بھی انحراف نہیں کرتے:

﴿ فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ﴾

''پس آپ کے رب کی قسم! وہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے نزاعی امور میں آپ کو حکم تسلیم کر کے آپ کے فیصلہ پر کچھ تنگی وضیق محسوس نہ کریں اور پوری طرح سر اطاعت خم نہ کر دیں''۔

موضوع بدل گیا۔ بات تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے عصر نور و غلبہ کی چل رہی تھی لیکن ہوتے ہوتے بات دورِ ذلت و ظلمت تک آ پہنچی' میں نے سلسلہ کلام روز روشن کے ذکر سے شروع کیا تھا پھر شب تیرہ و تاریک کے ذکر میں الجھتا چلا گیا۔ بات یہ ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ''جسد واحد'' سے تشبیہ دی ہے اور فرمایا ہے کہ مسلمان ایک جسم کی طرح ہے جس کے ایک عضو کو بھی تکلیف ہوتی ہے تو سارے اعضاء متاثر ہوتے ہیں۔ یہ حدیث مقررین' معلمین اور واعظین مستقل دہراتے رہتے ہیں اور ہم سنتے رہتے ہیں۔ ہم آیت قرآنی: ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ مستقل پڑھتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان مارے اور کاٹے جا رہے ہیں' ان کی آبروریزی اور توہین کی جا رہی ہے' ان کے بچے ان کے ہاتھوں سے چھینے جا رہے ہیں تاکہ وہ کفر پر پھلیں اور پھولیں۔ مگر بجائے اس کے کہ ہمیں غیرت و غصہ آئے اور ہم ان کے تعاون کے لئے صف آرا ہوں ہمیں میں سے بہت سے لوگ دشمنوں کے ایجنٹ' مددگار اور ہمارے دشمن و مخالف ثابت ہوتے ہیں۔

سن لیجئے! کہ نجات صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم اللہ کی

طرف لوٹیں' زمین کے سارے راستے ہمارے واسطے بند ہو چکے' صرف آسمان کا ایک راستہ کھلا ہوا ہے۔ اللہ کی طرف لوٹ آؤ۔ خدا تمہاری مدد دوبارہ فرمائے گا۔ اپنے دشمنوں کے لئے بقدر امکان طاقت وقوت کا ذخیرہ کرلو اور ساز وسامان جمع کرلو۔ ﴿وَ أَعِدُّوْ لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾ ہر طرح کی قوت جمع کرلو' اور اس قوت کا مقصد کامیابی نہیں ڈرانا اور دھمکانا ہے' قرآن نے فرمادیا ہے: ﴿تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ﴾ اس کا مقصد اللہ اور مسلمانوں کے دشمنوں کو ڈرانا ہے۔ ﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ کامیابی تو صرف اللہ ہی کی مرہونِ احسان ہے نہ کہ قوتوں اور ساز وسامان کی۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو مسلمانوں کے ساتھ مل کر کافروں سے لڑنے کے لئے اتارا' لیکن اتارنے کا مقصد کامیابی نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ مسلمان خوش و مطمئن وثابت قدم ہو جائیں' کیونکہ کامیابی تو صرف اللہ کے بس میں ہے۔

برادرانِ اسلام! اللہ کی طرف لوٹ و پلٹ آؤ۔ تمہارے لئے کامیابی وغلبہ مقدر ہے۔ مگر یہ لوٹنا زبانی' قولی اور رسمی نہ ہو' عملی و حقیقی ہو' گفتار کے نہیں کردار کے غازی بنو' ہر حال میں ہر موڑ پر انفرادی' اجتماعی ہر لحاظ سے اور جنگ وصلح ہر موقعہ پر اللہ پر اعتماد و رجوع ہونا چاہئے' کیونکہ کامیابی و غلبہ وہی عطا فرماتا ہے جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک وسہیم نہیں ہے۔

جاڑے کی رات کا سب سے سرد وقت سورج کی شعاعیں نمودار ہونے اور آفتاب کی کرنیں پھوٹنے سے پہلے کا ہوتا ہے' پھر جب سورج نکل آتا ہے تو اس کی گرمی سابقہ ٹھنڈک اور سردی کی مصیبت کو بھلا دیتی ہے۔ اسی طرح سب سے زیادہ ظلمت رات میں فجر کے طلوع سے پہلے ہوتی ہے' پھر جب صبح طلوع ہوتی ہے تو اس کا نور پچھلی ظلمت کو چھانٹ دیتا ہے اور یہ اصول ہے کہ جب جب تنگی وسختی بڑھتی ہے تبھی وسعت وفراخی آتی ہے۔ ﴿حَتّٰى اِذَا

اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوا جَآءَ هُمْ نَصْرُنَا ﴾ یہاں تک کہ جب رسل و انبیاء مایوس ہونے لگے اور ان کو یہ گمان ہونے لگا کہ ہمارے فہم نے غلطی کی تب ہماری مدد ان تک آ پہنچی ہے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم! اپنے حال کی تصویر کشی میں میں نے درازنفسی سے کام لیا ہے' اور ایسا اس لئے تاکہ اس کتاب کے مطالعہ کے وقت ہمیں زمانۂ عمر رضی اللہ عنہ کی عظمت کا احساس و ادراک ہو سکے۔ کیونکہ تندرستی کا ذکر بغیر بیماری کے ذکر کے مکمل نہیں ہوسکتا۔ **و بضدها تتبين الاشياء.**

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی کا یہ تاباں و درخشاں گوشہ دیکھئے' پڑھیئے' غور فرمایئے' اور یہ جان لیجئے کہ جس مدرسہ کے تلمیذ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تھے وہ مدرسۂ محمدی آج بھی وا ہے۔ جس مرکز سے انھوں نے اکتسابِ فیض کیا تھا اس کا فیض اب بھی جاری و ساری ہے۔ جس طریقۂ کار کو انھوں نے اپنایا تھا وہ آج بھی روشن و قابلِ اتباع ہے۔ جس پھول سے انھوں نے عطر کشید کیا تھا وہ ابھی مرجھایا اور خزاں رسیدہ نہیں ہوا ہے۔ جس شمع سے انھوں نے روشنی حاصل کی تھی وہ شمع اب بھی روشن و منور ہے اور جس باغ سے انھوں نے خوشہ چینی کی تھی وہ آج بھی سرسبز و شاداب اور ہرا بھرا ہے اور آپ کا منتظر و امیدوار ہے کہ آپ آگے بڑھیے۔ اسی طریقۂ کار پر کاربند ہو جایئے' اسی سیرت و کردار کے حامل بن جایئے۔ اسی سانچہ میں ڈھل جایئے۔ یقین فرمایئے کہ اگر آپ نے ایسا کرلیا تو دنیا کا غلبہ آپ کا نصیب ہوگا اور آخرت کی کامیابی آپ کے قدم بہ قدم رہے گی۔ ان شاء اللہ۔ کیونکہ ؎

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کے چمن سے روٹھی بہار اب بھی

علی الطنطاوی

نصف محرم ۱۴۱۳ھ

خطرناک اور شرمناک ارادہ

مکۃ المکرمہ کی ناقابل برداشت سخت گرمی‘ تپتی ریت‘ چلچلاتی دھوپ اور پھر کھڑی دوپہر کا وقت۔ ایسے جان لیوا اور صبر آزما وقت میں ایک بھاری بھرکم‘ لمبا تڑنگا‘ مضبوط وسخت انسان تلوار سونتے تیز قدموں سے آگے کو بڑھتا چلا جارہا ہے‘ جوشِ انتقام‘ جذباتی کیفیت اور ہیجانی صورتحال اُس کی ہر نقل و حرکت سے نمایاں ہو رہی ہے‘ مکہ کی وہ گرمی جس نے پورے علاقے کو انگارہ کی طرح دہکا دیا ہے اور جس سے آگ کے شعلے پھوٹ رہے ہیں اُس شخص کے عزم ورفتار پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہے‘ وہ عالمِ بے خودی میں زمین کو اس انداز سے روندتا چلا جارہا ہے جیسے زمین اس کے پاؤں تلے آکر ایک ذرّہ بے مایہ بن گئی ہو‘ وہ اپنے گرد وپیش آنکھیں اُٹھا کر دیکھ رہا ہے‘ جیسے آنکھوں سے شرارے نکل رہے ہوں اور غیظ وغضب کے آثار ظاہر ہوں‘ نہ اس کو چلچلاتی دھوپ کی فکر ہے‘ نہ ہی جلتے ہوئے سنگریزوں کی پرواہ‘ اور نہ ہی اسے اس گرم لو کا ذرا بھی خیال ہے جو جہنم کا منظر پیش کر رہی ہے۔ اس بے خودی اور بے خیالی کی صرف ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ اس قوی ہیکل وتوانا شخص کے سامنے ایک مقصد ہے جس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے وہ تن من دھن کی بازی لگانے پر آمادہ ہے‘ وہ اپنی ساری توانائیاں صرف کر کے ہر طرح سے اس مطلوب تک پہنچنے کے لئے کوشاں ہے‘ وہ مقصد ہے‘ ساری دنیا کے سردار اور پورے عالم کے آقا کا قتل وخون۔

یہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی جاہلی زندگی کی تصویر ہے۔ یہ ایسے انسان کی

تصویر ہے جو ابھی تاریخ کی چہار دیواری سے بہت دور' شب تیرہ و تار میں زندگی بسر کر رہا ہے' ایسا انسان جو تاریخ کی چہار دیواری سے قریب ہوا' نہ اس کی حدود میں داخل ہوا اور نہ ہی اپنے کارناموں کا پرتو اس پر ڈال سکا۔ ایسا انسان جو اس جاہلی کارواں کا ایک مسافر ہے جس کے سفر کا آغاز بھی صحراء کے بیچ ریتلے علاقے سے ہوتا ہے' پھر وہ اسی صحراء کے ریتوں پر سفر کرتا ہوا چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اسی صحراء میں ناپید ہو جاتا ہے' جس کا آغاز بھی عدم ہے اور انجام بھی عدم' نہ وہ تہذیب و تمدن کے مراحل طے کر پاتا ہے' نہ آبادی کے حدود میں رسائی حاصل کر پاتا ہے اور نہ ہی وہ علم و فن' ثقافت و تمدن' زندگی و ترقی کے گہوارہ سے قریب ہو پاتا ہے۔ بس وہ ایسا گمنام انسان ہوتا ہے جو گمنامی ہی کے عالم میں جیتا ہے اور اسی عالم میں مر جاتا ہے۔

اب تاریخ اس شخص کو مخاطب کر کے گویا ہے!

اللہ تعالیٰ کی عنایات

ذرا ٹھہرو! اپنی جاہلی زندگی سے' اس کی تاریکیوں اور محرومیوں سے دامن جھاڑ کر الگ ہو جاؤ۔ اسے خیر باد کہہ دو۔ کیونکہ تمہارا وہ اسٹیج تیار ہو چکا ہے جس پر تمہیں جلوہ افروز ہونا ہے' تاریخ میں تمہارا وہ منصب مقدر ہو چکا ہے جس پر تم فائز ہونے والے ہو' سرور کائنات محمد عربی ﷺ بہت جلد تمہیں ایک قیمتی و نایاب کلید عطا کرنے والے ہیں۔ جس سے تم تاریخ کے وہ بند دروازے کھول سکو گے جن سے تم ابھی تک ناآشنا و ناواقف تھے اور وہ بھی تم سے آگاہ و شناسا نہ تھے۔ یہ کلید اس لئے ملی ہے کہ تم تاریخ کے حرم میں بے دھڑک گھس جاؤ' اس کے زینوں پر چڑھتے چلے جاؤ' پھر اس کے صحنوں میں پہنچ جاؤ' پھر چڑھتے چڑھتے اس کی اونچی چھتوں اور بلند میناروں تک رسائی حاصل کر لو' پھر وہاں جا کر اس طرح رونق افروز ہو جاؤ کہ انبیاء کے قدموں میں رہو اور دوسرے عظیم الشان افراد کے سروں پر۔ ❶

ہاں.... مگر ٹھہرو! اس ہتھیار کو تو ہٹا دو جس سے تم اللہ کے دین کو فنا کرنے آئے تھے' اللہ کا دین فنا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس سے لڑا جا سکتا ہے۔ وہ ہر لمحہ اور ہر آن غالب رہے گا۔ یہ تلوار اُٹھا پھینکو جسے تم نے محمد ﷺ کو شہید کرنے کے لئے سونت رکھا تھا' تاکہ تم ان کے پیش کردہ مذہب' آفاقی پیغام

---

❶ حاشا و کلا! سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اعظم الناس بعد الانبیاء ہیں۔ ان کے بعد ہی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا درجہ ہے۔

اور لازوال وروشن تعلیمات کو ختم کر دیتے اوران کے گنے چنے انتالیس مخلص و بے لوث صحابہ کو موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ نہیں! یہ ناممکن تھا' محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور پوری نوعِ انسانی کے سردار ورہنما ہیں۔ ان کو شہید نہیں کیا جا سکتا تھا۔

محمد عربی ﷺ کا یہ نیا لایا ہوا دین و پیغام کبھی فنا نہیں ہوسکتا' اس کی قسمت میں ساری دنیا پر غلبہ' رہتی دنیا تک کامیابی وکامرانی' دوام وآفاقیت اور رفعت وعظمت سب کچھ لکھ دیا گیا ہے' یہ مٹھی بھر انتالیس آدمی کبھی پوری دنیا کے مالک وفرمانروا ہوں گے' یہی چالیس سے چالیس ہزار ہوں گے' چالیس لاکھ ہوں گے' چالیس کروڑ ہوں گے' بے شمار ولاتعداد ہوں گے' پورے کرۂ ارضی پر ان کا حکم چلے گا' عمر رضی اللہ عنہ! تمہاری تلوار ان کو ہلاک نہ کرے گی۔ بلکہ اللہ ان کو تمہارے واسطے سے عزت وغلبہ عطا کرے گا اور اپنے پیارے نبی کی تمہارے سلسلہ میں کی ہوئی دعا قبول کر لے گا' (دعا سے وہ دعا مراد ہے جو نبی کریم ﷺ نے ابوجہل وعمر رضی اللہ عنہ میں سے کسی کے قبول اسلام کے ذریعہ اسلام کو غلبہ عطا فرمانے کے سلسلہ میں کی تھی) بس اب آ جاؤ' یہ تلوار نیام میں کر لو' عورت پر اٹھنے والے ان ہاتھوں کو نیچے کر لو' (مراد یہ ہے کہ اپنی بہن سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا پر ظلم وزیادتی ان کے اسلام کی وجہ سے نہ کرو) آؤ اپنی جہالت' شرک' ظلم وسختی کو دھو ڈالو' تم کو اب اس ظلمت کدہ سے نکل کر اس مرکزِ نور میں چلنا ہے جو وادیٔ صفا میں دارالارقم کے نام سے واقع ہے' وہاں تم کو بانگ دہل یہ اعلان کرنا ہے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

یہ اسی آفاقی کلمہ "لا اِلٰہ اِلاَّ اللّٰہ ، محمدٌ رَّسول اللّٰہ" ہی کا اثر تھا جس نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو جاہلیت کی تیرگی سے اسلام کی روشنی میں' گمنامی کی پستیوں اور کھائیوں سے آسمانِ مجد وعظمت پر اور نسیان وعدم کے صحراؤں اور

بیابانوں سے تاریخ کے میدان تک پہنچا دیا' یہ اسی الٰہی پیغام کا کرشمہ تھا کہ جس کی وجہ سے ایک عمر ختم ہوا اور دوسرے عمر رضی اللہ عنہ نے جنم لیا۔

وہ تندخو' تنگ دل' سخت جاں اور بدمزاج عمر فنا ہوا جو قریش کا ہر قسم کی بداعمالیوں' ظلم' شرک' باطل و بے معنی ریاست و تکبر میں ہم نوا اور ساتھی تھا' جس کا محبوب مشغلہ باطل کو حق پر اور شرک و بت پرستی کی وحدانیت پر غالب و فائق کرنا تھا' اور اس عمر کی جگہ پر ایک دوسرا عمر پیدا ہوا جو حق و باطل کی معرکہ آرائیوں میں باطل کے لئے شمشیر براں' عزم و ہمت کی دھنی' عادل و انصاف پرور بادشاہ' مہربان و نرم خو انسان' بہادر و شجاع سپاہی' ماہر و کامیاب سپہ سالار ثابت ہوا' وہ ایسا عبقری انسان بنا جس نے بیک وقت چار چار سلطنتوں پر فرمانروائی کی' جو خلیفۃ المسلمین' امیر المومنین' دین اسلام کی عزت و عظمت کا پاسبان اور مجاہد بن کر کے سامنے آیا' اقبال کی زبان میں ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

عقل انسانی حیران و سرگرداں ہے اور صد بار تعجب کرنے پر مجبور ہے کہ آخر یہ کایا پلٹ کیسے گئی کہ جو انسان مکہ کی کڑی دوپہر میں سورج کی آگ برساتی شعاعوں میں گرمی کے موسم میں شمشیر برہنہ اور صرف اسی عزم سے نہایت طمطراق سے نکلا ہو کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تمام کر دے' اسے اس عزم کی تکمیل کے سوا کسی اور چیز کی فکر و دھن نہ ہو اور پھر وہ اس حال میں گھر کو لوٹے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ماں' باپ بلکہ سارے انسانوں سے زیادہ محبوب سمجھنے لگے ؎

جو نہ تھے خود راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

یوں تو انسانی زندگی میں بہتیرے ایسے لمحے آتے ہیں جو اس کی زندگی کا رخ

یکسر موڑ دیتے ہیں۔ مگر ہم بھی واقف نہیں اور شاید کوئی بھی آگاہ نہ ہو کہ ایسا بھی کوئی مبارک لمحہ آتا ہے' جس نے اِس انسان (سیدنا عمر رضی اللہ عنہ) کے دل کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی' کہ وہ دیہاتی گمنام انسان جسے اس کے قبیلہ کے سوا کوئی جانتا بھی نہ تھا یک بیک ایسا عبقری اور بلند پایہ انسان بن گیا کہ کچھ ہی دنوں کے بعد تاریخ اس کو قیصر و کسریٰ کے فاتح' کوفہ و بصرہ کے بانی و مؤسس اور وقت کے فرمانبرواؤں میں سب سے زیادہ عدل پرور' دانشمند' تجربہ کار' باطل کے حق میں دیوارِ آہنی' حق کے لئے ریشم کی طرح نرم' اور جہاندیدہ فرمانروا کے روپ میں دیکھنے والی تھی' یہی وہ لمحہ تھا جس نے پورے عالم میں تہلکہ مچا دیا' ایک ہلچل برپا کر دی' بہت سی سلطنتیں مٹیں اور بہت سی بنیں' بے شمار حکومتوں کے تختے الٹے گئے' اور بہت سی تہذیبیں وجود پذیر ہوئیں۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لیا' اب وہ موقعہ آ چکا تھا کہ حق و باطل کا فرق علی الاعلان واضح کر دیا جائے' اسلام گمنامی کی زندگی سے اور پردہ کی اوٹ سے باہر آئے' اب تک اسلام خفیہ طور سے پھیل رہا تھا' قریش مکہ کے سرکش' متکبر اور ظالم پنجوں سے دور مکہ کے ایک کنارے چھپ چھپ کر اسلام کی روشنی سے خوش نصیب لوگ مستفید ہو رہے تھے' جبکہ پورے مکہ میں شرک و باطل کا رعب و دبدبہ اور تسلط و غلبہ تھا' کفر و ضلالت کا دور دورہ تھا' شیطان دندناتا پھر رہا تھا' کعبۃ اللہ کے گرد بتوں کی ایک بھیڑ کھڑی کر دی گئی تھی اور قوم گمراہی کے آخری دہانہ کو پہنچ چکی تھی' اب وہ زرّیں وقت آ چکا تھا کہ یہ خوف و اختفاء ختم ہو' اسلام ایک کھلم کھلا دین کی شکل میں سامنے آئے' علی الاعلان اور بابانگِ دہل اس کا پیغام عام کیا جائے' دشمنوں کے ساتھ کوہِ استقامت بن کر جم جایا جائے' مقابل و حریف قوموں کو قعرِ مذلت میں دھکیل کر اسلام کو آگے بڑھایا جائے' کیونکہ اسلام ایک زمانہ تک صفا کی وادی میں پر

سکون ہو کر خاموشی اور انتہائی راز داری کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہ چکا تھا' جیسے کہ بیج زمین کی گہرائیوں میں رہتا ہے' پھر اٹھتا ہے اور پودے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے' اسلام بھی ایسا ہی بیج تھا' جس کے پودا بن کر نمودار ہونے کا وقت آ چکا تھا کہ وہ فضاء میں نمودار ہو اور پھلے پھولے' بلندیوں کو طے کر لے تاکہ تیس سالوں کے بعد وہ اس بلند و بالا اور وسیع وعریض درخت کی شکل اختیار کر لے جس کی شاخیں افریقہ کے صحراؤں سے خراسان کی وادیوں تک اور اناضول کے پہاڑوں سے عمان کے ساحل تک پھیل جائیں۔

مکہ کی سڑکوں پر اب وہ اسلامی مظاہرہ ہونے والا تھا' جس کے ذریعہ پیغام اسلام کی اعلانیہ ترجمانی کا فرض ادا کیا جانا تھا' جس میں سرفہرست اسد اللہ سیدنا حمزہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما تھے' یہ مظاہرہ ہونے والا تھا یہاں تک کہ مسجد حرام تک پہنچتا جہاں مسلمان کعبہ کے پاس پہلی نماز با جماعت ادا کرتے اور ان کی امامت امام الانبیاء سید المرسلین محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے' قریش کے کلیجے غیظ و غضب اور کینہ وحسد کی وجہ سے منہ کو آنے والے تھے' وہ اپنے ہی غضب و غصہ میں جل بھن کر خاکستر ہونے والے تھے۔ اب وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے' ان کی طاقت وقوت' جاہ وحشمت اور کبر ونخوت کا جنازہ نکلنے والا تھا' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اسلام لا چکے تھے' اللہ نے حق و باطل کے درمیان تفریق کر دی تھی۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو چکا تھا۔ یہ بہت چھوٹا سا مظاہرہ تھا' جس میں صرف چالیس انسان شریک ہوئے۔ مگر یہی چالیس تھے جنہوں نے اربوں مسلمان تیار کر دیئے اور نہ معلوم کل تک کتنے تیار ہوں گے۔ اس لئے کہ اس مظاہرہ میں حمزہ رضی اللہ عنہ تھے جو سید الشہداء ہیں' عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے جو اسلام کے سب سے بڑے فاتح ہیں' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے جو خلاصۂ انسانیت ہیں اور جن وانس اور ملائکہ سب میں ہر لحاظ

سے افضل و اشرف ہیں۔ یہ تاریخ ساز مظاہرہ جس میں چالیس انسان صفاء سے کعبہ تک کل دو سو قدم چلے تاریخ کا سب سے اہم' معروف اور عظیم مظاہرہ ہے جہاں سے وحدانیت ربانی' تائید حق' خیر کا تعاون اور نیک راہوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے' بلند اقدار کو باقی رکھنے کی بنیاد پڑی۔ یہ عظیم مظاہرہ ہمیشہ جاری رہے گا' یہ دلوں اور ذہنوں میں جاری رہے گا جب تک کہ دل و ذہن رہیں گے' اور اس مظاہرہ کے ساتھ تعظیم و عقیدت کے پہلو بھی ہمیشہ جڑے رہیں گے۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی؟

لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ اگر اسلام کا فیض جاری نہ ہوتا تو عمر رضی اللہ عنہ کا کیا مقام ہوتا؟ کیا یہ عبقری نادرۂ روز گار شخصیت ابھر کر سامنے آ پاتی' اگر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا التفاتِ خاص اور توجہ تام اسے حاصل نہ ہوتے؟ کیا عجیب و غریب متنوع کمالات کا حامل ایسا انسان ظہور پذیر ہو جاتا اگر اس پر نور الٰہی کا عکس نہ پڑتا؟ کیا اس کے بغیر عمر رضی اللہ عنہ کا تاریخ میں کوئی مقام ہوتا اور دلوں میں ان کا کوئی احترام ہوتا؟ کیا وہ اس زمانے تک زندۂ جاوید رہ جاتے کہ ان کے سلسلہ میں بیسوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور کیا وہ اگلے زمانوں تک باقی رہ سکتے جہاں ہزاروں مصنّفین ان کی سیرت لکھنے کا شرف حاصل کریں گے؟

سیرتِ عمر پر جس شخص کا گہرائی اور سنجیدگی سے مطالعہ ہے' جو جاہلی عمر (گو اس کے حالات ہم تک نہیں پہنچ سکے ہیں) اور اسلامی عمر کی زندگیوں میں تقابل کر سکتا ہے جس نے حیرت بھری نگاہ سے تاریخ کے صفحات پر یہ منظر دیکھا ہے کہ عمر کی شخصیت کی کایا پلٹ کیسے ہوگئی' عمر نے ایک روپ سے دوسرا روپ یک بیک کیسے دھار لیا اور اس کی ساری فطرت و طبیعت' سارے افکار و خیالات اور ذہنیت یکایک اس ایک ہی لمحہ میں کیسے بدل گئے جب وہ نبی کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اس کی زبان کلمۂ توحید کے ذائقہ و حلاوت سے آشنا ہوئی اور اس کا قلب معرفتِ الٰہی کی لذت سے آگاہ ہوا' اس ایک لمحہ میں کیسے اس کی نشأۃِ ثانیہ ہوگئی' کیسے اس نے نیا جنم لیا اور کیسے وہ بلندی اور رفعت کے مدارج

طے کرنے لگا۔ وہ عظمت کی چوٹیوں پر بلکہ جنت کی بلندیوں پر چڑھنے لگا؟
تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ہر ایسا انسان بخوبی جانتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ان سارے معاملات میں ہر لحاظ سے اسلام کے مرہونِ منت ہیں' یہ کرشمہ اور فیض ہے اسی دینِ محمدی کا جس کی تاثیر و تسخیر کی شہادت تاریخ کے ہر ہر صفحہ پر زریں داستانوں کے روپ میں آج تک جوں کی توں محفوظ و مرقوم ہے۔

ہاں! کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسلام کے بغیر بھی اور دین محمدی سے فیضیاب ہوئے بغیر بھی عبقریت ظاہر ہوتی ہے' اس کے اثرات دکھائی دیتے ہیں مگر فی الواقع وہ ایک محدود' ناپائیدار' مائل بہ زوال اور پھسپھسی عبقریت ہوتی ہے۔ ایسا ہوسکتا تھا کہ اگر عمر اسلام کے چشمۂ جاری سے سیراب نہ ہوتے تو بھی ان کی عبقریت ظاہر ہوتی' وہ مکہ کے لیڈروں میں اہم مقام کے حامل ہو جاتے' قریش میں ان کی عظمت کا سکہ بیٹھ جاتا' ان کی ہیبت و جلال کا سب اعتراف کر لیتے اور ان کے اثرات مرتب ہونے لگتے' مگر پھر یہ طے تھا کہ ان کا نام مکہ کی اس محدود وادی سے جو جرول سے حجون تک ہی کو کٹی ہوئی ہے آگے ہرگز نہ بڑھتا' وہ ایک محدود قسم کے انسان بن جاتے' ان کے جوہر دب کر رہ جاتے۔ مگر یہ اسلام ہی کا فیض و کرم تو تھا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی عظمت و رفعت کے آثار دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچے' مکہ کی وادیوں اور عرب کے دیہاتوں سے نکل کر عراق و شام کی سرحدوں میں جا گھسے' اور آنے والی نسلوں تک منتقل ہوئے۔ اگر یہ دین محمدی نہ ہوتا تو پھر یہ سب کچھ نہ ہوتا۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر اسلام نہ تھا تو پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی وہ عبقریت کس کام کی رہتی جو تنگ افق ہی میں محصور رہ جائے؟ ایسے شہر میں زندگی گزار کر عمر کیا کارنامے انجام دے سکتے جو ساری دنیا سے ہر لحاظ سے الگ تھلگ ہو' جہاں تا حد نگاہ سراب ہی سراب ہو' ریت کی ایک دنیا بسی ہوئی ہو'

جس کا دیگر ترقی یافتہ متمدن ممالک سے صرف تجارت کے سلسلہ میں برائے نام ربط و تعلق کے سوا کوئی جوڑ نہ ہو' جہاں دو چار گھسی پٹی پرانی خبروں کے علاوہ دنیا کی کوئی خبر تک نہ پہنچ پائے' نہ وہاں فلسفۂ یونان سے آشنائی ہو' اور نہ حکمتِ ہندی سے شناسائی' نہ فارس و روم کی بین الاقوامی سیاسی خبروں کے پہنچنے کا کوئی ذریعہ اور نہ ہی کسی سے ربط و ملاقات کا کوئی موقعہ۔ کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ بکس میں محبوس چراغ نے کسی کو روشنی پہنچائی ہو؟ بلکہ ایسا چراغ تو خود ہی جلتا رہتا ہے مگر کسی کو اس کی بھنک بھی نہیں ملتی' پھر اس کا تیل ختم ہو جاتا ہے' اور وہ اسی حال میں گل بھی ہو جاتا ہے مگر کسی کو خبر بھی نہیں ہونے پاتی۔ کیا ایسا نہ ہوتا کہ ہزاروں محدود عبقریتوں کی طرح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی عبقریت بھی زمین کے کسی گمنام گوشہ میں پسماندہ اور پچھڑے ہوئے طبقہ و علاقہ میں یوں مدفون ہو کر رہ جاتی کہ تاریخ کے کسی صفحہ پر اس کا کہیں نام و نشان بھی نہ ہوتا؟ حقیقت یہی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ آفتابِ اسلام کی ایک روشن شعاع ہیں' بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک معجزہ۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام

اظہار دین و اعلاء کلمۃ اللہ کا نقطۂ آغاز

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام گویا ایک ناگہانی زلزلہ بن کر مکہ کی وادیوں میں آیا تو سارا قبیلۂ قریش انگشت بدنداں رہ گیا' سب کو بڑا زبردست جھٹکا لگا' جب اس جھٹکے اور سانحہ کے اثرات سے وہ کچھ باہر آئے تو اس کا فطری ردِعمل یہ سامنے آیا کہ وہ اس نئے دین کے استیصال کی ہر ممکنہ کوششوں میں مصروف ہو گئے' طرح طرح کی سازشوں' منصوبوں اور پلانوں کے ذریعہ اس پیغام ربانی کی بیخ کنی کو اپنا مقصد حیات اور اصلی مشن بنا لیا اور نبی اکرم ﷺ سمیت تمام ہی مسلمانوں کو نوع بہ نوع ایذا رسانیاں شروع کر دیں' مگر ان تمام سازشوں سے بے پرواہ ہو کر رسول اکرم ﷺ پیغام الٰہی کی تبلیغ کرتے رہے' عذاب آخرت سے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر قبول اسلام کی دعوت دیتے رہے' اور برسرعام یہ اعلان کرتے رہے کہ اگر وہ سچے دل سے اسلام کے سایۂ رحمت میں آ کر پناہ گزیں ہو جائیں تو روم و فارس کی بظاہر ناقابل تسخیر نظر آنے والی سلطنتیں ان کے زیرنگیں آنے والی ہیں' اور مزید براں آخرت میں انہیں اللہ کی وہ جنت نصیب ہوگی جس کی چوڑائی آسمان وزمین سے بڑھ کر ہے:

﴿ وَ سَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ ﴾

اور دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین و آسمان جیسی ہے۔ مگر یہ دعوت ابھی تک قبول عام حاصل نہ کر سکی تھی' ماحول ناساز گار تھا اور فضا نا مساعد' کفار مکہ اپنی گمراہی و

بدروی میں حد سے آگے جا چکے تھے' ان کے دل پتھروں اور چٹانوں سے بھی سخت ہو چکے تھے' نہ وہ قرآن کے مضامین میں غور و فکر کر رہے تھے اور نہ نرم رو یہ اپنا کر اس دعوت کی طرف ملتفت ہو رہے تھے' غرضیکہ وہ ضلالت و شقاوت کی ساری سرحدیں عبور کر چکے تھے' قرآن کریم میں پتھروں کا ذکر یوں آیا ہے:

﴿وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰر ، وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءَ ، وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ پتھرون میں سے تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس میں سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں' کوئی پھٹتا ہے اور اس میں سے پانی نکل آتا ہے اور کوئی خدا کے خوف سے لرز کر گر بھی پڑتا ہے۔

افسوس و تعجب ہے ان دلوں پر جو پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت تھے۔ قرآن میں ہے: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر بھی اتارا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جا رہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے۔ مگر یہ دل جن پر قرآن اتارا گیا تھا وہ کسی طور سے نرم نہیں پڑ رہے تھے' اطاعت و انقیاد کا جیسے کوئی خانہ ان کے ہاں تھا ہی نہیں۔

مکہ کے افق پر آفتاب چار ہزار چار سو چوبیس[1] بار اپنی ضوفشاں کرنیں منور کر چکا ہے' مطلع بھی ایک ہی ہے' کوئی تبدیلی بھی نہ آئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ شب و روز' علانیہ و خفیہ' فرداً فرداً بھی اور گروہ در گروہ بھی ہر طرح سے اپنے دعوتی مشن میں انتھک اور جان توڑ کوششیں صرف کئے جا رہے ہیں' دوسری طرف قریش مکہ دلوں میں کدورت و عداوت اور بغض و نفرت کا ایک جہاں بسائے مخالفت' جنگ' ظلم و ستم اور ایذا رسانیوں پر اتر آئے ہیں' نبی کریم ﷺ جب چلتے ہیں تو قریش راہوں میں کانٹے بچھاتے ہیں' حالت نماز میں

---

[1] یہ بعثت سے ہجرت تک کا وقفہ ہے یعنی دوشنبہ ۶ راگست ۶۱۰ء سے دوشنبہ ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء تک۔

چلا' قریش کو ان مسلمانوں کی عزیمت وقوت اور جوہر شجاعت کا اندازہ تو اس وقت ہوا جب مسلمانوں کا کارواں میدانِ بدر میں ان کے کشتے کے پشتے لگا کر اور ہر طرح سے پسپا کر کے آگے بڑھا اور کچھ ہی عرصہ میں مکہ پر اپنی فتح و کامرانی کے علم لہرا دیئے۔ بہر حال سب مسلمان ہجرت کر گئے مگر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ' بہادر و دلیر عمر رضی اللہ عنہ' قریش کے ظلم وستم کے سامنے سپر انداز نہ ہوئے' نرم نہ پڑے' اپنے اسلام کا بانگ دہل اعلان کیا' مشرکین کو مارا بھی اور مار بھی کھائی' انہوں نے دین محمدی کی حفاظت وتوسیع کے لئے ہر طرح کے آلام و اذیت میں لذت وراحت پائی' یہ وہی عمر رضی اللہ عنہ تو ہیں کہ جب ان کے ماموں ابوجہل نے انہیں قریش کی ایذا رسانیوں سے بچانے کے لئے اپنی پناہ دے دی تو انہوں نے یہ جواز اس کے منہ پر دے مارا اور اسے دھتکار کر دوبارہ میدان میں آ گئے' اور دین کی توسیع میں اذیتیں سہتے رہے اور اذیتیں دیتے رہے۔ آخر کار وہی غالب رہے' اپنے اور کمزور و بے بس انسانوں کے دفاع میں وہ کامیاب ہی رہے' تو پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ عمر رضی اللہ عنہ مکہ سے چھپ کر مدینہ ہجرت کر جائیں۔ یہ تو عمر رضی اللہ عنہ کی شجاعت کے خلاف عمل ہوتا؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی تیاری کی' تلوار لی' کمان و تیر ساتھ میں لیا' عصا بغل میں لیا' مسجد حرام پہنچے' مقام ابراہیم پر آ کر نماز ادا کی' پھر قریش کی ایک بڑی جماعت کے سامنے آ کر تنہا ان سب کو دعوت مبارزت دیتے ہوئے کہا:

''تمہارے چہرے بگڑ جائیں اور ناک خاک آلود ہو جائے' جسے اپنی ماں کو لاولد' اپنے بچوں کو یتیم اور اپنی بیوی کو بیوہ کرنا ہو وہ مجھ سے اس وادی کے ادھر آ کر مل لے۔ میرا مدینہ ہجرت کرنے کا سفر ہے' جسے تابِ مقابلہ ہو وہ بخوشی آئے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ان سے کمزور مسلمانوں کا ایک گروہ جا ملا' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو کچھ نصیحتیں اور رہنمائیاں کیں اور پھر سفر پر روانہ ہو گئے' کسی مشرک کو مقابلہ پر آنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

ہجرتِ نبویؐ کے اسرار و رموز

یہاں ایک اشکال پیش آ سکتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تو علی الاعلان و برسرِ عام قریش کے سربر آوردہ لوگوں سے بے خوف ہو کر ہجرت کے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ خفیہ طور پر ہجرت کر رہے ہیں۔ کیا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ دلیر و بہادر ہیں؟

نہیں! واللہ نہیں! سیدنا عمران رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں زیادہ دلیر و نڈر نہیں ہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے، جبکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے پیشتر دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے، مقصد قتل تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رعب و دبدبہ اور ہیبت و جلال کچھ ایسا مؤثر ہوا کہ عمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں گر پڑے، ان کے پورے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور آگے چل کر جب بھی کوئی معرکہ آرائی ہوئی، دشمن کے حملے سخت ہوئے، میدانِ کارزار گرم ہوا ہر موڑ پر عمر سمیت تمام صحابہ نے دامنِ نبوت میں آ کر پناہ لی، حفاظت پائی اور عزم و ہمت کا انمول ذخیرہ اور بیش بہا خزانہ لے کر واپس ہوئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد جب ارتداد کی فضا ہموار ہوئی اور پورا جزیرۃ العرب اس کی لپیٹ میں آ گیا تو اس نازک صورتحال نے سارے صحابہ کے دل دہلا دیئے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی اندیشوں کے شکار ہو گئے اور مصالحت و نرمی سے معاملہ کو نمٹانا چاہا اور حرب و ضرب کو بے موقعہ اور مصالح کے خلاف سمجھا تب وہ ابوبکر ہی تو تھے جو سر پر کفن باندھ کر میدان میں کودے تھے۔ ساری دنیا ایک طرف تھی اور ابوبکر ایک طرف۔ آخر کار فتح و کامرانی نے آگے بڑھ کر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قدم چومے۔ یہی وجہ ہے کہ ابوبکر

افضل الناس بعد الانبیاء قرار پائے ؎

اولو العزمانِ دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر پاٹتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

سیدنا عمران حقائق سے بخوبی واقف و گاہ تھے' پھر کیا وجہ تھی جو عمر نے برسرعام اعلان کر کے ہجرت کی اور نبی کریم ﷺ و ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چھپ چھپا کر؟ اصل میں بات کچھ اور ہے' مسئلہ شجاعت و بزدلی کا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سربراہِ عام جب جنگ کے ایک محاذ سے دوسرے محاذ کو کوچ کرتا ہے تو وہ راستہ میں کسی دشمن کے سامنے آ کر اسے دعوتِ مبارزت نہیں دیتا' بلکہ دشمنوں کو دیکھ کر ان سے بچتا بچاتا چپکے سے دور ہو جاتا ہے' اس لئے کہ اگر وہ اس موقعہ پر شجاعت کے نمونے دکھانے لگے اور ان سے مقابلہ پر کمربستہ ہو کر میدان میں اتر پڑے تو وہ اس لشکر سے ہاتھ دھو بیٹھے گا جو دوسرے محاذ پر اس کی راہ تک رہا ہے۔ اور اس کے اشاروں پر کام کرنے پر آمادہ و مستعد ہے۔ نتیجتاً وہ اس بڑے معرکہ میں ہزیمت و شکست سے دوچار ہو جائے گا جس کے لئے اس نے یہ لشکر ترتیب دیا تھا اور معمولی سی راستہ میں ملنے والی فوج ہی سے مقابلہ کرتا رہ جائے گا اور منزلِ مقصود سے دوری بڑھتی چلی جائے گی۔ بہرحال اس سربراہ کا یہ لڑنا بھڑنا شجاعت و بلند حوصلگی نہیں کہلائے گا اور اس کا فرار بزدلی اور عاجزی نہیں ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ بھی قائد اعظم تھے' وہ جنگوں کے سپہ سالار تھے' یہ قریش و ہوازن کی جنگ نہیں تھی بلکہ یہ شرک و جہالت اور ظلم و ستم کے خلاف جنگ تھی' نبی اکرم ﷺ انھیں جنگوں کے سربراہ تھے جو ازل سے حق و باطل کے مابین چلی آ رہی ہیں اور حق کی مدافعت کا کام اب انھیں کو کرنا تھا جو محمد ﷺ کے جھنڈے تلے اکٹھا ہوئے تھے تو کیا محمد ﷺ علی الاعلان ہجرت کر کے اپنی اس عظیم مہم کو چھوڑ دیتے اور قریش کی ایک چھوٹی سی نفری سے ہی مقابلہ کرتے رہتے؟ نہیں! ہرگز نہیں! بس یہی خفیہ ہجرت کا راز ہے۔

غزوۂ بدر

حق و باطل کا فیصلہ کن معرکہ

ابھی تک مسلمان مکہ میں تھے تو ان کے اور کفار و قریش کے مابین لڑائی انفرادحیثیت کی تھی۔ ایک فرد کا دوسرے فرد سے مقابلہ تھا اور ایک جماعت دوسری جماعت سے برسرپیکار تھی' مگر جب ہجرت مکمل ہوگئی' اسلام نے یثرب میں اپنے پاؤں جما لئے یثرب نے خوش دلی سے اسلام کا استقبال کیا اور اپنے لختہائے جگر اسلام کی مدد کے لئے آگے کر دیئے تو یہ اختلاف و عداوت انفرادی نہ رہی بلکہ اجتماعی اور قومی ہوگئی۔ شرک و بت پرستی کے دلدادہ' کفر و باطل پر مضبوطی سے اڑے ہوئے اور اس کے لئے جان کی بازی لگا دینے والے قریش اور نورِ توحید سے روشن و معمور مدینۂ پاک کے باشندوں' اسلام کے سپاہی اور دین کے داعی' اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے تن من دھن سے کوشاں مسلمانوں کے درمیان اختلاف کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا' ہر طرح کی گفتگو ناکام ہوگئی' صلح و مصالحت کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی اور جنگ کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہ گیا۔

امن و سلامتی کے داعی حضرات آج جنگ کی مذمت میں جتنا بھی کہیں اور جتنا بھی اس کی ہولناکیوں کا منظر دکھائیں اس سے نفرت دلائیں اور اس سلسلہ میں جتنی بھی کتابیں لکھ ڈالیں اور تصنیفات مرتب کر ڈالیں اس حقیقت سے کون منکر ہوسکتا ہے کہ عرب میں اس وقت عظیم الشان' مقدس اور اہم جنگوں

کا سلسلہ جاری تھا' یہ وہ جنگیں تھیں جو مدافعتِ حق' دین برحق کے دفاع اور مجرموں کی تنبیہ کے مقصد سے بڑے زور و شور سے جاری تھیں' اس مقصد سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کس کو حق پہنچتا ہے کہ فوج کو چوروں اور مجرموں کے مقابلہ پر آنے سے روک دے کہ مجرم فساد پھیلاتے رہیں اور خلقِ خدا پریشان ہوتی رہے۔ قاضی کو کون روک سکتا ہے کہ وہ قاتل کو قتل نہ کرے' اور مجرم کو گرفتار نہ کرے' وہ تو قاتل کو قتل کرا کے پوری قوم کی زندگی اور مجرم کو گرفتار کرا کے پوری ملت کو آزادی بخش رہا ہے۔

مقام بدر پر ہونے والی معرکہ آرائی اس سلسلہ کی سب سے پہلی اور زبردست کڑی تھی' جو صلح و سلامتی' حق و اسلام اور عدل و مساوات کے انقلاب آفریں پیغام کو عام کرنے کے لئے مقصد کے تحت وجود میں آئی تھی۔ کفار مکہ کا ایک ہزار پر مشتمل مجرموں کا دستہ چوروں اور ڈاکوؤں کی سی اتراہٹ و گھمنڈ سے اور قاتلوں کے سے زور و تکبر کے ساتھ دندناتا اور اکڑتا ہوا میدانِ بدر میں آیا' دوسری طرف مسلمانوں کی ٹولیاں تواضع و انکساری اور خشوع و خضوع کا مظاہرہ کرتے ہوئے اللہ پر مکمل یقین و اعتماد کے ساتھ میدان میں اتریں' ان کے دلوں میں یہ حقیقت جاگزیں تھی کہ حق کی طاقت کے سامنے کوئی طاقت کبھی پنپ نہیں سکتی' ایمان کے ہتھیار کو کوئی ہتھیار کند نہیں کر سکتا' اور انکا مقصد صرف روئے زمین کو شرک و کفر کی غلاظتوں اور ظلم و ستم کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنا اور سرکش شہنشاہی کے آمرانہ طاغوتی اور فاسد نظام کے مفاسد و شرور سے خلق خدا کو بچانا ہے۔ دونوں پارٹیاں میدانِ بدر میں صف آرا ہو کر آمنے سامنے آئیں۔ حق و باطل اور نور و ظلمت کے تصادم کا اس زمین نے ایک بار پھر مشاہدہ کیا' چور اور سپاہی پہرہ دار رو در رو کھڑے ہوئے۔ تاریخ عجیب دوراہے پر کھڑی نتائج کی شدت سے منتظر ہے کہ غلبہ مسلمانوں کو حاصل ہو رہا ہے یا کفار

کو فتح مل رہی ہے۔ اس لئے کہ اگر اسلام فتحیاب ہوتا ہے تو ترقی اور رفعت کے دروازے مسلمانوں کے لئے وا ہو جائیں گے' وہ اپنی مقدس تہذیب وثقافت کو عملی طور پر ساری دنیا کے سامنے رکھ کر ایک عظیم اسلامی انقلاب لائیں گے اور دین حق کا بول بالا ہو جائے گا اور اگر کفر کو غلبہ ملتا ہے تو یہ مٹھی بھر مسلمان ایسے بے نام ونشان ہو جائیں گے کہ کوئی خدا کا نام لیوا باقی نہ رہ جائے گا اور کفر و باطل کی تاریکیاں ساری روشنیوں کو رفتہ رفتہ نگلتی چلی جائیں گی۔ تاریخ بے چینی سے نتیجہ برآ ہونے کی خواہاں ہے کہ اچانک غبار چھٹتا ہے اور اسلام کا پرچم سر بلند دکھائی دیتا ہے' کفر و باطل کے پرچم سرنگوں ہو چکے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخلصانہ دعائیں' بے لوث جدوجہد' اصحاب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانبازیاں اور جاں نثاریاں اپنا رنگ لائی ہیں۔ صنادید قریش کی ایک اچھی خاصی تعداد جہنم رسید ہو چکی ہے۔ درندے اور پرندے ان کی لاشوں کو نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ دنیا نے ان کو کچھ نفع نہیں پہنچایا اور آخرت میں تو ان کا انجام معلوم ہی ہے۔ دوسری طرف کفار کا ایک بڑا طبقہ مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہو کر مدینہ کی عدالت میں حاضر کیا جا چکا ہے۔ تاریخِ انسانی کی سب سے زیادہ مقدس اور انصاف پرور عدالت مدینہ میں لگ چکی ہے جس کے سربراہ سردارِ دو جہاں جناب محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جس کے اہم رکن سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں' جنھیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کا قائد ونمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ سکریٹری کا منصب شاعر رسول صلی اللہ علیہ وسلم' انصار کے ترجمان بطلِ جلیل سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے۔ عدالت کی کارروائیاں شروع ہوتی ہیں۔ قیدی مجرموں کا جرم قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے۔ سکریٹری کا مطالبہ یہ ہے کہ چونکہ یہ مجرمین جہنم کو جھٹلاتے تھے اس لئے ان کی سزا آگ ہی کی ہونی چاہئے۔ لکڑیاں جمع کی جائیں اور اس میں ان کو جلا دیا جائے۔ اس مطالبہ کے بعد عدالت میں مذاکرہ

کا سلسلہ شروع ہوا۔ سربراہِ اعلیٰ نے ارکانِ مجلس سے ان کی آراء معلوم کیں۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ (جو ارحم الامۃ کہلاتے ہیں) کی نرم دلی کا ظہور ہوا' ان کی رائے یہ ہے کہ مجرموں کو فدیہ لے کر آزاد کر دیا جائے۔ یہ اسلام کے لئے قوت وطاقت کی بات ہوگی۔ مجرموں کو قتل نہ کیا جائے' کیونکہ کچھ بھی سہی وہ بھائی بند اور اعزہ واقارب ہی ہیں۔ مگر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ (جو شدت فی دین اللہ کے وصف میں ممتاز ہیں) نے اس رائے کی سخت مخالفت کرتے ہوئے سب مجرموں کو یکسر جہنم رسید کرنے کا مطالبہ کیا کہ یہ کفار کے پیشوا' اور سربرآوردہ لوگ ہیں' یہ دعوتِ اسلامی کے راستہ کی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ اس لئے اب ضروری ہے کہ اسلام کا راستہ محفوظ و پر امن ہو جائے اور دعوتِ اسلامی کا مشن ہر قسم کی رکاوٹوں اور خطرات سے دور رہ کر نہایت اطمینان وسکون سے انجام دیا جا سکے۔ سربراہِ اعلیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں رائیں سماعت فرمائیں اور خاموشی سے دونوں کا جائزہ لیا اور پھر فیصلہ صادر فرمایا جس میں حضرت ابوبکر کی رائے قابلِ ترجیح قرار پائی۔ مگر یہ فیصلہ پھر بارگاہِ الٰہی سے بدل کر از سرِ نو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے حق میں دوبارہ ظاہر ہوا۔ قرآن میں ہے:

﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ، لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴾

''کسی نبی کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے' تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو' حالانکہ اللہ کے پیشِ نظر آخرت ہے اور اللہ غالب وحکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی''۔

غزوۂ احد میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی ثابت قدمی

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا رتبہ بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بعد بلا شرکتِ غیرے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا درجہ ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ دعوتِ اسلامی کے مبلغ اعظم، اسلام کے بیباک و نڈر سپاہی تھے، غزوۂ اُحد کے موقعہ پر جب اچھے اچھوں کے پاؤں اکھڑنے لگے اور قدم لڑکھڑانے لگے اس وقت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پائے ثبات و استقلال میں ذرا سی بھی جنبش نہ آئی۔ انھوں نے اپنا آپ اسلام کے سپرد کر کے اپنے جوہر اور ایمانی قوت و شجاعت کے مظاہرے دکھا دیئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان کو دنداں شکن جواب دینے کے لئے انھیں کا انتخاب فرمایا اور بالآخر انھوں نے ابوسفیان کو انتہائی دلیری و ہمت سے حوصلہ شکن جواب دیا۔ ہوا یہ تھا کہ ابوسفیان یہ سمجھ بیٹھا کہ ہمارے اس ناگہانی حملہ میں جو لوگ مارے گئے ان میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے دونوں صاحب سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی ہیں۔ ابوسفیان کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ قریش اس نئے دین سے چھٹکارا پا چکے ہیں۔ اب وہ اس بدعت سے خلاصی حاصل کر چکے ہیں۔ اب تو صرف کعبہ کے گرد نصب شدہ معبودانِ باطل یعنی بتوں کے کنارے حلق اور مجلسیں لگانی ہیں۔ انھیں کی زبان بولنی ہے اور اپنے فرزندوں کی اسی نہج پر تربیت کرنی ہے تاکہ آئندہ ایسا کوئی موقعہ نہ آ سکے کہ وہ اپنے آباء واجداد کے دین و مذہب سے بیگانہ و منحرف ہو کر کسی اور رخ پر سوچ سکیں۔ ابوسفیان کے دل میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ اسلام موسمِ گرما کی ایک بدلی ہے جو ظاہر ہوئی اور پھر دیکھتے دیکھتے ایسا چھٹی کہ اس کا

کوئی نام ونشان تک باقی نہ رہ سکا۔ مگر ابوسفیان اس حقیقت سے آشنا نہ ہوسکا کہ اسلام ایک ابدی اور آفاقی پیغام ہے۔ جو زمین سے زیادہ مضبوط و پائیدار' پہاڑوں سے زیادہ مستحکم و ثابت' زندۂ جاوید اور لافانی ہے' آسمان و زمین ٹوٹ کر بکھر سکتے ہیں اور ریزہ ریزہ ہو سکتے ہیں مگر یہ آسمانی پیغام جوں کا توں باقی رہے گا' اسے کوئی زوال و فنا نہیں۔ ہبل کی اور ان معبودانِ باطل کی کیا حیثیت! یہ ذرہ ہائے بے مایۂ پتھروں سے تراشے ہوئے ٹکڑے یا کانوں اور معدنوں کے اجزاء! جنہیں تم اپنے ہاتھوں بناتے ہو اور اپنے پیروں سے روندتے ہوئے آگے کو نکل جاتے ہو۔ پھر بھی انہیں رب العالمین کی برابری میں لا کھڑا کرتے ہو' تف ہو تمہاری عقلوں پر' ابوسفیان! یہ کونسی عقل و خرد ہے؟ کہاں یہ ہاتھوں کے تراشیدہ پتھر کے بے جان بت اور کہاں رب العالمین کی قدرت و وسعت؟

معرکۂ احد برپا ہوا تو اس میں غزوہ بدر کی طرح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کامیابی و کامرانی سے سرفراز ہوئے' واللہ یہ دونوں معرکے برابر ہیں' نہ کفار کو احد میں غلبہ مل سکا اور نہ مسلمان مغلوب ہوئے کیونکہ مشرکین مکہ نے مکہ سے مدینہ تک کی طویل ترین مسافت (پانچ سو کلومیٹر) اس لئے نہیں طے کی تھی کہ ان کا سربراہ صرف اُعْلُ هُبَلُ ، اُعْلُ هُبَلُ. (ہبل کا سایہ بلند ہو) کا نعرہ لگاتا ہوا جائے اور پھر ویسے ہی واپس لوٹ آئے' انہوں نے تو یہ سفر مدینہ کو زیر نگیں لانے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) ختم کرنے اور اسلام کی بیخ کنی کے مقصد سے کیا تھا' تو اب کیا وجہ تھی کہ وہ مدینہ کو چھوڑ کر واپس آ رہے ہیں' جبکہ صرف نصف گھنٹہ کا فاصلہ باقی رہ گیا ہے' پھر مدینہ میں کوئی قابل ذکر حفاظتی دستہ بھی نہیں تھا۔ اب اس کا کیا مطلب ہے کہ وہ مدینہ میں گھس کر لوٹ مار نہیں مچا رہے ہیں اور قبضہ نہیں کر رہے ہیں؟ ان کا سربراہ اعلیٰ اپنے دشمنوں یعنی محمد

صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب الرسول کو کیسے مہلت دیئے ہوئے ہے اور ان سے گفت وشنید میں مصروف ہے۔ اگر وہ غالب و فاتح ہے تو انہیں اپنے منصوبوں کو عملی شکل دینے کے لئے قتل وقید کیوں نہیں کرتا؟ اور مسلمانوں کے لشکر کو مفتوح ومغلوب کیسے قرار دیا جائے جبکہ اس کے کمانڈر ثابت قدم ہیں' اس کے افسران مستقل مزاجی سے مصروف عمل ہیں۔ اس کا دل مطمئن و ثابت ہے اور علم بلند ہے۔ ہاں! اگر حقیقت ہے تو صرف اتنی کہ تھوڑی دیر کے لئے اسلامی فوج کے قدم لڑکھڑا گئے تھے جبکہ حضرت خالد بن الولید (مشرکین کے کمانڈر) کا ناگہانی حملہ ہوا اور تیر اندازوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اور اسلامی لشکر کے بعض دستے خوف زدہ اور حیران ہو کر بھاگے' لیکن اصل دستے اور کمانڈروں کی بقیہ فوج سب کی سب اپنے اپنے مرکزوں پر جم کر دشمن کو مدینہ کی طرف قدم بڑھانے سے روکنے میں لگی رہی' نتیجہ وہی ہوا کہ دشمن مایوس ہو کر روانہ ہو گیا اور اسلامی لشکر اپنی دفاعی اسکیم میں بڑی عظیم کامرانی سے ہمکنار ہو گیا۔ کیونکہ دوبارہ حملے کے بعد اسلامی لشکر کی پوزیشن دفاعی لشکر کی تھی' اور دفاعی فوج کی سب سے زبردست کامیابی یہی ہے کہ وہ دشمن کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر کے اپنے مرکز ومستقر کی حفاظت کا بندوبست کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ اور اسلامی لشکر نے یہی کارروائی بحسن وخوبی انجام دی' مگر اس کے لئے اسے بڑی قربانیاں دینی پڑیں اور بہتیرے مسلمان قتل کئے گئے' بہر حال معرکۂ احد اسلام کے حق میں کامیابی ہی تھا اور بلاشبہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس معرکہ کے شہ سواروں اور ہیروؤں کی صف اوّل میں جگہ پانے کے بجا طور پر مستحق وحقدار ہیں۔

صلح حدیبیہ اور غیرتِ فاروقی

آپ پوری سیرت پڑھ جایئے ہر جگہ آپ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو روشن و تاباں پایئے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر موقعہ پر عمر رضی اللہ عنہ کا نام نمایاں نہ ہو اور ان کا تذکرہ ہر جگہ موجود نہ ہو۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو چمکتا ہوا آفتاب تھے جس کی موجودگی میں ستارے خود ہی مدہم پڑ جاتے ہیں' گو وہ بہت ہی روشن و چمکدار ہوں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ آسمانِ اسلام کا دمکتا ہوا تارہ تھے۔ اپنی شخصی قوت و ہمت اور اپنے پختہ و مصمم عزائم کی وجہ سے کبھی ہمت نہ ہارے بلکہ اسلامی محاذ کے طاقتور جانباز و بلند پرواز پہلو کی مستقل نمائندگی کرتے رہے' اور اس موڑ پر نہ انہوں نے سستی و غفلت کو پسند کیا اور نہ ہی نرمی و کوتاہی کو۔ اللہ کی شریعت و طریقت کی راہ میں انہیں کسی ملامت کا اندیشہ نہیں دامن گیر ہوا اور نہ ہی کبھی انہوں نے مداہنت برتی۔

صلح حدیبیہ کے موقعہ پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ معاہدہ پر رضامند نہ تھے اور ان کا اصرار تھا کہ جنگ کی کارروائی شروع کی جائے۔ وہ بصد الحاح و اصرار یہ کہہ رہے تھے کہ معاہدہ کیوں ہو؟ کیا ہم حق پر اور کفار باطل پر نہیں ہیں؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ہمارے مقتولین جنت میں اور مشرکین کے مقتولین جہنم میں جائیں گے؟ پس کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے دین کے سلسلہ میں اس معاہدہ کی ذلت پر راضی ہو جائیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا' ابن خطاب! میں اللہ کا سچا فرستادہ ہوں' اللہ مجھے کبھی بھی ضائع نہیں کر سکتا' مگر سانحہ کی شدت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دل و دماغ پر سوار رہی' انکا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا' تو وہ سیدنا صدیق

اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو صدیق اکبر نے کہا: ابن خطاب! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پیغمبر ہیں، اللہ انہیں ہرگز ضائع نہیں کر سکتا۔ یہ اس موقع پر ہوا جبکہ سارے صحابہ کرام اس حادثہ کی آزمائش سے دوچار تھے اوران میں کوئی قوتِ برداشت باقی نہ تھی۔ مگر یہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کا یقین واستقلال تھا کہ وہ اس نازک موڑ پر سب سے جداگانہ حیثیت کے مالک تھے۔ آخر کار مرورِ ایام نے نبوت کی حکمت آشکارا کردی، فتح مکہ کا عجیب ومحیر العقول واقعہ پیش آیا، تب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کی پختگی اور درستگی کا کامل یقین ہو گیا، اور اپنی اس دن کی تلخ کلامی سے خائف ومتاسف ہو کر تلافیٔ مافات کے طور پر انہوں نے صدقہ، خیرات، نماز، روزہ، نوافل وعبادات اور غلاموں کو آزاد کرنا شروع کر دیا۔ جبکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی تھی اور نہ ہی کوئی بے ادبی۔ بس ان کی اپنی ایک رائے تھی اور ذاتی اجتہاد تھا، ان کو توقع تھی کہ اس اجتہاد میں بھی پہلے کی طرح موافقت الٰہی نصیب ہو جائے گی۔ ورنہ اطاعت رسول میں تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو شہرت حاصل ہے۔ وہ تو رسول کی خوشنودی کی ہر چیز پر ترجیح دیا کرتے تھے، جبکہ واضح مثال یہی ہے کہ انہوں نے یہ قسم کھائی کہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کا اسلام انہیں اپنے باپ ''خطاب'' کے اسلام سے زیادہ محبوب ہے۔ اس لئے کہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کا اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے لئے اہل وعیال، اہلِ قرابت بلکہ اپنی جان ودل سے بھی زیادہ محبوب تھے۔ اطاعتِ رسول اور رسول کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھنے کی اس سے بڑی کیا مثال ہو سکتی ہے؟

وفاتِ نبویؐ پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی بے اختیارانہ حالت

اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا' اسلام کو غلبہ حاصل ہوا' پورے جزیرہ پر اسلام چھا گیا۔ سارے عرب اس کے سامنے سرافگندہ ہو گئے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر جسے بجا طور پر **المؤتمر الاعظم** (عظیم کانفرنس) کہا جا سکتا ہے' سارے مسلمان میدان عرفات میں جمع ہوئے اس موقعہ پر اللہ رب العزت نے قرآن کی آخری آیت[1] اور دستور اسلامی کا آخری جزء نازل فرمایا:

﴿ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ﴾

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا' تم پر اپنے انعامات تمام کر دیئے' اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین کے منتخب و پسند کر لیا''۔

چنانچہ مسلمان کمال دین اور تمام نعمت سے سرفراز ہوئے اور نبی اکرم ﷺ کھڑے ہو کر تقریر فرمانے لگے' یہ الوداعی خطاب تھا' جس میں آپؐ نے انسانی حقوق کا مکمل اعلان فرما دیا۔ حریت (آزادی) عدالت (انصاف) مساوات (برابری)۔

پھر نبی اکرم ﷺ مدینہ تشریف لے آئے اور چند ہی ایام کے بعد آپ کو بیماری نے آ گھیرا رسول اکرم ﷺ کی بیماری سے سارے صحابہ گھبرا

---

[1] آخر سے مراد وہ آیت ہے جو تقریباً اخیر موقعہ پر نازل ہوئی ہے۔

اٹھے' اس صدمہ نے انہیں اپنے بال بچوں سے غافل و لا پروا بنا دیا' ان کی آنکھوں کی نیند' دن کا چین' رات کا آرام لٹ گیا۔ نہ انہیں کھانا راس آتا نہ پانی' کسی کام میں ان کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ہر طرف سے بے پروا ہو گئے' یہ سب کچھ رسول اکرم ﷺ کی بیماری کے غم میں تھا' ان کی دل سے یہ تمنا تھی کہ اگر روئے زمین پر موجود ساری چیزوں کو آپ کے فدیہ میں پیش کیا جا سکتا تو پیش کر دیں۔ رسول کے بارے میں وہ ہر وقت اور ہر لمحہ سوال کرتے رہتے اور ان کے حالات جاننے کی کوشش کرتے رہتے۔ پھر جب رسولؐ کے وصال کے حادثہ جانکاہ کی خبر صحابہ کرام کو ملی تو ان کی عقلیں اڑ گئیں' انگشت بدنداں رہ گئے اور بڑا زبردست دھچکا لگا' وہ حیرت زدہ رہ گئے' ان کے ہوش اڑ گئے' ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کریں' ان پر تو قیامت بیت گئی تھی اس میں کوئی تعجب نہیں کہ رسول کی آمد اور بعثت سے قبل صحابہ کرام گویا مردہ تھے' جب رسول مبعوث ہوئے تب جا کر ان کے تن مردہ میں جان آئی' رسولؐ ان کی زندگی کا سبب اور ان کا اول و آخر سب کچھ تھے' تب ان کی وفات صحابہ کرام کی زندگی کا اور ان کی دنیا کا خاتمہ کیسے نہ ہوتی اور آپ ﷺ کی وفات کا دن قیامت صغریٰ کا منظر کیوں نہ پیش کرتا؟

سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اس ہولناک خبر کو سن کر حیران و ششدر رہ گئے اور گھبرا اٹھے' رسول کی ذات والا صفات سے فرط محبت ہی کی وجہ سے ان کے دل کو آپؐ کے وصال کا حادثہ پیش آنے کا یقین نہیں آ پا رہا تھا' ان کے بس سے یہ باہر تھا کہ آپؐ کے بغیر وہ زندگی گذارنے کا تصور بھی کر سکیں۔ ان کے کانوں کو یہ خبر سننا گوارہ نہ تھا' اسی کا ردعمل تھا کہ انہوں نے اپنی تلوار سونت لی اور باہر آ کر غلبہ محبت و جذبات میں لوگوں سے کہنے لگے: ایسا نہ کہو کہ رسول کا وصال ہو گیا' نہیں! ان کا وصال نہیں ہوا ہے' وہ اپنے پروردگار کی خدمت میں

تشریف لے گئے ہیں جیسے حضرت موسیٰ چالیس دنوں تک اپنی قوم کو چھوڑ کر بارگاہ الٰہی میں گئے تھے پھر واپس آ گئے تھے۔ بخدا اسی طرح رسول اکرم ﷺ بھی واپس آئیں گے جیسے سیدنا موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تھے اور آ کر ان لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر سزا دیں گے جو یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ رسول کا وصال ہو گیا ہے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اس ہوشربا سانحہ کے موقعہ پر مدینہ سے باہر اپنے مکان میں مقیم تھے جو سنح میں آباد تھا' سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا وجود گویا اس پختہ اور زبردست عقل کی مانند تھا جسے حوادث مضطرب و بے قرار نہیں کرتے اور گردش روزگار چیں بجبیں نہیں بناتی جبکہ اس موقعہ پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی مثال اس حساس قلب کی طرح تھی جو جوش و جذبات' فرطِ عشق اور غلبۂ محبت کے احساس و شعور سے متاثر ہو' چنانچہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور نبی اکرم ﷺ کی پیشانیٔ مبارک کو بوسہ دیا' پھر باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ غیظ و غضب میں تلوار سونتے لوگوں سے خطاب فرما رہے ہیں' سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں چپ کرانا چاہا مگر وہ چپ نہ ہوئے اور اپنی بات جاری رکھی' ایسا انہوں نے قصداً اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مخالفت میں نہیں کیا بلکہ وہی احساس لطیف ان کے قلب و دماغ پر طاری اور محبت کا سمندر متلاطم تھا جس نے کسی دوسری طرف توجہ دینے کا موقعہ ہی نہ دیا۔ بالآخر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا خطاب شروع کیا۔ یہ وہی تاریخی خطاب ہے جو تقریباً تمام کتبِ سیرت میں بڑی اہمیت سے مذکور ہے:

اَلَا! یَا اَیُّهَا النَّاسُ : مَنْ کَانَ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَ مَنْ کَانَ یَعْبُدُ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ.

''اے لوگو سنو! جو محمد ﷺ کا پجاری تھا وہ سن لے کہ محمد ﷺ اس دنیا سے پردہ فرما چکے اور جو خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کا پرستار تھا وہ

سنے کہ اللہ زندۂ جاوید ہے اسے موت نہیں آ سکتی''۔

پھر یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى أَعْقَابِكُمْ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَّ سَيَجْزِى اللّٰهُ الشَّاكِرِيْنَ﴾

''محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں' ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں' پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے' یاد رکھو! جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا''۔

یہ عظیم تاریخی حقائق پر مبنی خطاب جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سنا تو وہ ہوش میں آ گئے ایسا لگا جیسے وہ خواب سے بیدار ہو گئے ہوں' ان کو احساس ہو گیا کہ وہ غلطی پر تھے' اب ان کو علم ہوا کہ وہ خسارہ میں ہیں کہ اب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار نہیں ہو سکتا' ان افکار نے ان کے قویٰ مضمحل کر دیئے' ان کے قدم بے جان ہو گئے اور وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔

سیدنا فاروق رضی اللہ عنہ کا شورائی و متفقہ انتخاب

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین منتخب ہو کر خلیفۃ المسلمین متعین ہو گئے' تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ آپ کے نائب و مشیر کار رہے' مدینہ کے قاضی بھی رہے' اکثر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کی رائے سن کر عمل کیا کرتے تھے' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہی نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے جمع قرآن کی تجویز رکھی تو سیدنا ابوبکر کچھ دنوں متردّد رہے' پھر اُن کی رائے مان لی اور قرآن جمع ہو گیا' پھر جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی حیات کے آخری ایام میں قدم رکھا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے بعد خلافت کے لئے متعین فرما دیا' لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت اس متوارث خلافت سے جداگانہ تھی جس میں خلفاء اپنے فرزندوں یا قرابت داروں کے بارے میں وصیت کر جاتے ہیں۔ بلکہ یہ تو ایک پارلیمانی انتخاب تھا۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خلافت عمر فی زمانہ رائج انتخابی دساتیر و قوانین میں سب سے درست' عادلانہ اور منصفانہ دستور کے تحت منعقد ہوئی۔ کیونکہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے لئے بالاجماع تمام اہلِ حل و عقد صحابہ کرام نے منتخب کیا تھا اور یہی صحابہ کرام اسلامی پارلیمنٹ کے ارکان و ممبران تھے جیسے کہ آجکل کے قانون کے مطابق ممبران پارلیمنٹ صدر جمہوریہ کو منتخب کرتے ہیں۔ خلیفہ کی پوزیشن و حیثیت اسلام میں صدر جمہوریہ ہی کی سی ہے' ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ کافی زمانہ صدارت جمہوریہ کا منصب متعینہ مدت کے لئے خاص ہوتا ہے اور اسلام میں یہ منصب زمانی تعین سے بالاتر ہے اور تا زندگی باقی رہتا ہے۔ چنانچہ سیدنا ابوبکر مسند خلافت پر جلوہ گر ہوئے پھر

جب ان کو اپنی زندگی کے ایام پورے ہوتے نظر آئے تو لوگوں کو اپنے پاس بلایا اور انہیں اپنی بیعت سے آزاد کر کے فرمایا کہ میری زندگی ہی میں آپ حضرات جسے چاہیں اپنا امیر منتخب کر لیں تا کہ بعد میں کسی طرح کی اختلافی صورتحال نہ پیدا ہو پائے گویا سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اصحاب حل وعقد کے سامنے اپنا استعفا پیش کر کے کسی اور کو خلیفہ بنانے کی درخواست کی' یہ خلافت کیلئے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کا پہلا مرحلہ تھا۔

دوسرا مرحلہ یوں طے ہوا کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے استعفاء کے بعد صحابہ کرام وہاں سے واپس آ کر نئے خلیفہ کے انتخاب کے سلسلہ میں باہم گفتگو میں مصروف ہوئے' بڑے غور وخوض کے بعد بھی جب یہ معمہ حل نہ ہو سکا اور کوئی بات نہ بن پائی تو پھر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس واپس آئے اور کہا کہ خلیفۃ المسلمین! اس انتخاب کے سلسلہ میں آپ کی رائے پر ہم لبیک اور آمنا وصدقنا کہنے کو تیار ہیں۔ گویا نیا خلیفہ طے کرنے کی ذمہ داری انہوں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حوالہ کر دی۔ اب خلافت کے لئے عمر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کا تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے' یہ بڑا ہی نازک وحساس مسئلہ تھا جس میں سابقہ تجربوں کی طرح پھر سیدنا ابوبکر کی دور اندیشی' بلند نظری' حکمت' دانشمندی' فہم وتدبر اور شوریٰ کے اصول ومبادی کے سلسلہ میں سوجھ بوجھ کا ظہور ہوا' سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کبار صحابہ اور ممبران شوریٰ کو بلایا اور سب سے مشورہ فرمایا۔ پھر جب یہ یقین ہو چلا کہ لوگ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے نام پر متفق ہیں تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد کرنے کا عزم بالجزم کر لیا۔ مگر بعض صحابہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے مزاج کی شدت وسختی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس رائے کی مخالفت اور سیدنا ابوبکر سے سوال کیا۔ جیسے ممبران پارلیمنٹ ارکان حکومت سے کسی مسئلہ میں بحث کر رہے ہوں۔ کہا کہ آپ اپنے پروردگار کو کیا جواب دیں گے' اگر اس نے اس مسئلہ

میں آپ سے باز پرس کی؟ اس وقت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بڑے اعتماد و یقین سے نہایت درست و بلیغ جواب دیا کہ اس وقت میں اللہ سے کہوں گا کہ اے اللہ! میں نے آپ کی مخلوق پر آپ کے بہت نیک بندے کو خلیفہ بنایا ہے' اس انتخاب کا چوتھا مرحلہ اس وقت شروع ہوا جب یہ نام لوگوں کے سامنے پیش پیش کرنے کا مسئلہ آیا۔ جیسے کہ عدالت و کونسل میں کسی نائب کی تجویز پیش کی جاتی ہے یا کسی پارلیمانی پارٹی کی تشکیل کی داد پیش کی جاتی ہے تاکہ موافقت و مخالفت سامنے آسکے' چنانچہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نمائندہ ایک خط لے کر عوام کے مجمع میں آیا اور سب سے کہا کہ وہ خط میں مذکور نامزد خلیفہ (بغیر نام کی تصریح کے) کی خلافت پر اتفاق کرلیں۔ تو سارے لوگوں نے بیک رائے اتفاق کر لیا' سیدنا علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب نے کہا کہ میں اتفاق نہیں کرسکتا الّا یہ کہ مذکور شخص سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہوں۔ چنانچہ جب انہیں بصراحت معلوم ہوگیا کہ وہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہی ہیں تو انہوں نے بھی اتفاق فرمالیا۔ پانچواں مرحلہ عام بیعت کا تھا جو تین دن تک مدینہ میں جاری رہی' گویا یہ ایک جمہوری و عوامی الیکشن تھا۔ یہ خلافت کے لئے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کی تفصیل ہے۔ ہر کوئی اندازہ کرسکتا ہے کہ کیا یہ طریقہ ان سارے طریقوں میں کسی سے کمتر یا غیر موثر ہے جو فی زمانہ صدر کے انتخاب کے لئے دنیا کے متمدن سے متمدن اور بے انتہا ترقی یافتہ ممالک میں اپنائے جاتے ہیں؟

خلافتِ فاروقی کے معیاری اصولِ حکمرانی

افضل الناس بعد الانبیاء سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا وصال ہو گیا۔ آپ کو جوارِ رسول میں دفن کر دیا گیا۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تدفین کی کارروائیوں سے فراغت کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مسندِ خلافت سنبھالی اور اپنا تاریخی خطاب فرمایا۔ یہ افتتاحی خطاب تھا جس میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے طریقۂ کار اور سیاست کی پوری وضاحت فرمائی۔ یہ خطاب موجودہ دور کے حکمرانوں کے خطبات سے الگ و جداگانہ حیثیت کا حامل تھا۔ موجودہ حکمرانوں کے خطاب میں شیریں الفاظ کا ایک ذخیرہ ہوتا ہے' اس میں ایسے منصوبوں کا ذکر ہوتا ہے جن کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کا تصور بھی مشکل ہوتا ہے' ایسی آرزوئیں اور اُمیدیں ظاہر کی جاتی ہیں جن کا پورا ہونا ہر ایک کو ناممکن ہی معلوم ہوتا ہے' بلکہ درحقیقت یہ خطاب لوگوں کو مسحور کرنے' خوش کرنے اور زبانی جمع خرچ سے لوگوں کو دھوکا دینے اور بیوقوف بنانے ہی کے مقصد سے ہوتا ہے۔ مگر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس وقت روئے زمین کے سب سے افضل و اشرف انسان تھے انہوں نے جو کہا وہ کر دکھایا' اور کہ کر کر دکھانے میں وہ نادرۂ روزگار اور فرد فرید ثابت ہوئے' انہوں نے اعلان کر دیا کہ میری اطاعت صرف جائز معاملات میں درست ہے' ناجائز اور خلاف شرع امور میں اطاعت درست نہیں ہے' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ قانون کے پابند صدر جمہوریہ تھے انہوں نے قرآن کو اپنا قانون بنا رکھا تھا' اسی کے احکام کو نافذ کرنے میں ساری زندگی صرف کر ڈالی' وہ بادشاہ مطلق نہ تھے جو اپنی ذاتی آراء واحکام کو قانونِ شرعی بنا کر پیش کرے' نہ ہی وہ ظالم متکبر

حکمراں تھے جو اپنی ماتحت رعایا کو غلام و خادم سمجھ کر ان کے ساتھ انہیں جیسا سلوک کرے۔

بیت المال کے سلسلہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال میں اپنے حق کی وضاحت فرمادی کہ وہ اپنا درجہ یتیموں کے ولی و ذمہ دار ہی کا سمجھتے ہیں کہ اگر یتیم کا ذمہ دار مال دار ہے تو یتیم کے مال میں سے کچھ نہ لے اور اگر ضرورت مند ہے تو بقدرِ ضرورت لے لے' انہوں نے خلافت کو مالِ غنیمت نہ سمجھا اور نہ ہی لوگوں پر زور جمانے اور تکبر کرنے کا ذریعہ بنایا۔ اور خلافت کے مال و دولت میں مالکانہ ناجائز تصرف بھی کبھی نہیں کیا' اپنی پوری خلافت کے زمانہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اسی عام قانون کے تابع رہے اور یہ انہیں کی بلند پرواز عقل تھی کہ تن تنہا وہ ایک طویل عرصہ تک اتنی زبردست و وسیع سلطنت کو عدل و انصاف کی بے نظیر و ناقابلِ بیان ڈگر اور روش پر بآسانی چلاتے رہے اور اس میں پوری طرح کامیاب رہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کو ان کے حقوق سے آگاہ اور واقف کراتے اور ان کو خلیفہ اور دیگر والیوں و حاکموں کی نگرانی اور دیکھ ریکھ کی تاکید و ترغیب کرتے' یہاں تک کہ بسا اوقات صراحتاً یہ کہہ دیتے کہ لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنوں ہی میں سے کسی کو والی تجویز کر لیں' پھر اگر وہ ٹھیک طرح سے کام کرے تو اس کی پیروی کریں اور اگر گڑبڑ کرے اور ظلم و زیادتی و ناانصافی سے کام لے تو اسے قتل کر دیں۔ ایک بار ایسے ہی موقعہ پر سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ بیچ میں اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ والی اگر گڑبڑ کرے تو اسے معزول کر دیا جائے' آپ قتل ہی کا حکم کیوں فرماتے ہیں؟ تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں! قتل بعد کے لوگوں کے لئے سامانِ عبرت کے طور پر زیادہ مفید ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دوٹوک سبق لوگوں کو سکھایا پھر ان کا امتحان بھی

لیا اور منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں سے سوال کیا کہ لوگ خلیفہ کے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے اگر وہ کج روی اختیار کرے؟ تو لوگوں نے وہی جواب دیا جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا منشا تھا' جب انہیں یقین ہو گیا کہ یہ سبق ذہن نشین و جاگزیں ہو گیا ہے اور عوام خلیفہ پر لازم اپنے حقوق سے آگاہ ہو چکے ہیں تب جا کر انہیں اطمینان وسکون اور انبساط و سرور نصیب ہوا' آپ خود ہی غور فرمایئے ......
ہے کوئی ایسا بادشاہ و سربراہ جو اپنی رعایا کے سامنے انتہا پسند قومی لیڈر اور زبردست حکومت مخالف لیڈر کے روپ میں سامنے آئے اور لوگوں سے یہ مطالبہ و تاکید کرے کہ وہ اگر حکومت وقت میں کوئی بے انصافی' کج روی اور بے راہ روی محسوس کریں تو وہ حکومت کی اچھی طرح خبر لیں' دار و گیر اور محاسبہ کریں اور یہ سب کارگر نہ ہو تو شمشیر کے زور پر ساری غلط رویاں دور کریں۔ کیونکہ یہ ان کی ذمہ داری اور فرض ہے؟

عہد فاروقیؓ کی عالمگیر فتوحات

مسلمان سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مسلسل بیعت کرتے رہے اور ان کو ''امیر المومنین'' کے لقب سے پکارتے رہے اور مصافحہ کرتے رہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ان سب سے بے پرواہ ہو کر اپنی نگاہیں دور دراز افق پر جمائے ہوئے تھے۔ وہ تفکر و تدبر کے بحر ناپیدا کنار میں غلطاں و پیچاں تھے۔ انہوں نے دور دور اپنی روشن و دور بیں نگاہیں دوڑائیں' انہیں دو کمزور و ناتواں سلطنتیں نظر آئیں جو کرۂ ارض کے نصف حصہ میں بٹی ہوئی تھیں اور اپنی بیجا آمرانہ روش ظالمانہ و قاہرانہ حکومت اور ڈکٹیٹرانہ رویہ کی وجہ سے دنیائے انسانیت کی امیدوں' آرزوؤں اور تمناؤں پر شب خون مارنے کا کام انجام دے رہی تھی۔ عدل و انصاف' حریت و آزادی' مساوات و برابری کا خون ہو چکا تھا' مستقل تخریبی کارروائیاں جاری تھیں' ظلم و تشدد' ذلت و دنائت' خباثت و کمینگی کی سیاست چل رہی تھی' دفعتہً سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے کانوں میں وہ صدائیں گونج اٹھیں جو ان ظالموں کے بیجا تشدد کی تاب نہ لا کر مظلوم اور کچلے ہوئے پسماندہ طبقوں کی زبانوں سے آہ و نالہ وفریاد بن کر نکلی تھیں' کیونکہ ان کی تمنائیں بے ثمر ہوئی تھیں' ان کی آرزوؤں کو ظلم و ستم نے برگ و بار لانے سے پہلے ہی دفن کر دیا تھا' ان کی زبان بند کر دی گئی تھی' اب وہ لاشعوری طور پر آسمان سے کشائش و فراخی کا انتظار کر رہے تھے' ان کو توقع تھی کہ امن و سلامتی اور عدل و انصاف کے درو وا ہونے والے ہیں۔ وہ صبحِ حیات و بقاء کو طلوع ہوتا محسوس کر رہے تھے۔ ان کے کانوں میں ''أليس الصبح بقريب'' کی آواز گونج رہی تھی' کیونکہ کاہنوں اور

پادریوں اور دینی حلقوں میں نئے نبی کی بعثت اور عدل وسلامتی کو عام کرنے کی بشارتیں اور پیشین گوئیاں بڑے زور وشور سے پھیلی ہوئی تھیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سوچ کر بے اختیارانہ جواب دیا: لبیک! لبیک! ہم حاضر ہیں! ہم آ چکے ہیں! نبی آخرالزماں کا پیغام عام کرنا' اسلام کو چار دانگ عالم میں پھیلانا ہمارا دینی فریضہ اور مذہبی مطالبہ وتقاضا ہے۔ ہاں! اب یہ وقت آ چکا ہے کہ ہم کسریٰ کی سلطنت (عجم کی شہنشاہت) فارس وایران کی فتح کے لئے قدم تیز سے تیز تر کر دیں' ایسا کیوں نہ کیا جائے۔ اس راہ میں کیا رکاوٹ ہے؟ کیا اسلام نے ناقابلِ تعبیر خوابوں کو تعبیر نہیں دی' ناقابل تصور چیزوں کو حقائق و واقعات کا روپ نہیں دیا؟ کیا یہ ناممکن ومحال نہیں سمجھا جاتا تھا کہ سردارانِ قریش' انصار کے سربرآوردہ حضرات اور عرب کے مانے جانے مشہور افراد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان کے جھنڈے تلے آ جائیں گے اور اطاعت کریں گے؟ زمانۂ جاہلیت میں کس کے تصور میں یہ آ سکتا تھا کہ یہ سارے منتشر اور باہم برسرِپیکار قبائل ایک سایہ کے نیچے مجتمع ہو کر شانہ بشانہ کام میں شریک ہوں گے؟ جبکہ دو بھائی بکر وتغلب کے درمیان باہمی جنگ کی وجہ سے مسلسل چالیس برس تک کشت وخون کا معرکہ جاری تھا' عبس وذبیان کی باہمی جنگ' ربیعہ ومضر کا آپسی اختلاف اور دیہات میں ملنے والے ہر دو آدمیوں میں لڑائی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل رہا تھا' خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں' اور پورا جزیرۂ عرب میدان جنگ بنا ہوا تھا' مگر اسلام پیغام رحمت وعدل اور مساوات لایا' معجزۂ نبوت نے اپنا اثر دکھایا' اور مساوات واتحاد کی ایک فضا بن گئی۔ تو اب کیا مشکل ورکاوٹ تھی جو سب کے سب ایک آواز ہو کر دنیائے انسانیت کو پیغامِ حق سے واقف کرانے کے لئے قدم نہ بڑھاتے اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے ساری دنیا کو اسلام کا تابع اور قرآن کا پیرو نہ بناتے؟

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو ان کا رھوارِ عقل وفکر خندق کی اس رات کی طرف لے گیا جب غزوۂ خندق کی تیاریاں زور وشور سے جاری تھیں اور تمام قبائل عرب کے سیل رواں سے حفاظت و پناہ کے لئے مدینہ کے گرد خندق کی کھدائی کا کام بڑی تیزی سے چل رہا تھا' جہاں ایک سخت چٹان آنے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کدال ہاتھ میں لی اور ایک تاریخی ضرب لگائی جس نے شام وعراق کے محل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں کے سامنے روشن کر دیئے' تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے شام وعراق کی فتح کی بشارت دی اور وعدہ فرمایا۔ اب بشارت کے ایک حصہ کی تکمیل ہو چکی تھی' شام و روم کا نصف حصہ فتح ہو چکا تھا۔ تو اب فارس وعراق کیسے زیر نگیں نہ آتا؟ جبکہ یہ بشارت نبوی تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا ''اے مسلمانو! آؤ..... فتحِ فارس کا موقعہ آ چکا ہے..... قدم بڑھاؤ..... پیش قدمی کرو..... فارس تمہارا منتظر ہے!

ایران اسلام کے سایۂ رحمت میں

لیکن .... لوگوں کے ذہن سے ابھی تک کسریٰ کا رعب و دبدبہ اس کی شان وشوکت اور جاہ وجلال یکسر محو نہ ہو سکا تھا' زمانہ جاہلیت میں فارس وایران کی بیجا تعظیم وتقدیس' احترام واکرام' شجاعت و بسالت' جواں مردی و ہمت اور غلبہ وفوقیت کا جو تصور وسراپا ان کے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں رچ بس گیا تھا وہ ابھی پوری طرح ختم نہ ہو پایا تھا۔ ان کے ذہن سے یہ اوجھل نہ تھا کہ وہ کسریٰ کے غلاموں کے غلام کو بادشاہ عرب بنا کر اس کی ہر طرح تقلید وتعظیم کرتے تھے' اس کو عطیات وانعامات سے نوازتے تھے' اور اسی سے مدد طلب کرتے تھے' عرب شعراء ان کی خدمت میں زبردست قصائد پیش کرتے تھے' عرب تو نعمان جیسے والی کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہ پاتے تھے تو وہ کسریٰ پر اس کی سلطنت ومستقر میں جا کر کیسے حملہ کر سکیں گے؟ جب رومن امپائر جیسی سلطنت سپر پاور ہونے اور ناقابلِ بیان جنگی صلاحیتوں اور ہتھیاروں کے مالک ہونے کے باوجود فارس کا جنگی مقابلہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی اور فارس کے پایۂ تخت کے قریب بھی نہ پہنچ سکی تو یہ کمزور وناتواں عرب اپنے مریل اونٹوں اور زنگ خوردہ تلواروں سے اتنے عظیم وزبردست لشکر پر کیسے حملہ آور وفاتح ہو سکتے ہیں؟ جب قسطنطنیہ مدائن پر قابو نہ پا سکا تو چٹانوں اور سنگلاخ وادیوں میں بسا ہوا یہ الگ تھلگ گاؤں کیسے اس پر قابو پا سکتا اور فتحیاب ہو سکتا ہے؟ نہیں! ایسا ہونا محال ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تین دن تک لوگوں کو حربِ فارس پر آمادہ وراغب

کرتے رہے' مگر کوئی آگے نہ آیا' کیونکہ یہ محاذ بڑا ہی زبردست' سخت اور مشکل محاذ تھا' جس پر جانے کی ہمت کرنا ہر کسی کے بس کا کام نہیں تھا۔ مگر پھر بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ہمت نہ ہاری بلکہ پکارتے رہے کہ کہاں گئے وہ جانباز و بہادر' اور ہمت و جرأت کے ساتھ حملہ آور مہاجرین صحابہ؟

اس زمین میں سفر کرنے کا وقت آ گیا ہے جس کا وارث بنانے کا قرآن میں اللہ تعالیٰ نے تم سے مطالبہ کیا ہے۔ بلاشبہ اللہ اپنے دین کو غلبہ عطا فرمانے 'والا' اپنے مددگاروں کو غالب و باعزت کرنے والا اور اپنے پاکباز بندوں کو امتوں کی میراث عطا فرمانے والا ہے۔ اللہ کے نیک بندے کہاں ہیں؟ چنانچہ چوتھے روز سیدنا ابوعبید بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ لوگوں کا ایک گروہ سامنے آیا' تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ابوعبید کو ان پر امیر بنا کر مہم پر روانہ فرمادیا۔

شام اسلامی فتوحات میں

اس کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نگاہ توجہ شام کی طرف موڑی' وہاں کے مسائل و معاملات طے فرمائے' اور مشکل امور حل کیے' ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو وہاں کے لئے اسلامی فوج کا سپہ سالار وامیر نامزد فرمایا اور سیدنا خالد بن الولید سیف اللہ کو قیادت کے منصب سے الگ فرما دیا' سیدنا خالد رضی اللہ عنہ بلا شبہ نابغۂ روزگار اور یکتائے زمانہ کمانڈر' شہ سوار اور قائد تھے' جن کی بے نظیر ہمت و جرأت اور بے مثال ہوش مندی و دانائی کے چرچوں نے بڑے بڑے سور ماؤں کے دل دہلا دیئے تھے۔ تاریخ ان کی نظیر و مثال پیش کرنے سے قاصر ہے' ان کے لازوال جنگی کارنامے رہتی دنیا تک تاریخ کے صفحات پر زرّیں نقوش کی شکل میں تاباں رہیں گے اور مشعلِ راہ ثابت ہوتے رہیں گے' سیدنا خالد بن الولید نادرۂ روزگار ہستی تھے' ان جیسا انسان صدیوں میں رونما ہوتا ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

دنیا میں بڑے بڑے سورما اور اولوالعزم فاتحین و قائدین آئے' اسکندر' ہنیبعل' ابن قاسم' قتیبہ' طارق بن زیاد اور نپولین سب کا طوطی بولتا تھا مگر سیدنا خالد بن الولید کی عظمت کا اندازہ لگانا بڑا ہی مشکل کام ہے' وہ ان سب سے کہیں زیادہ عظیم تھے ؎

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کی زندگی و مآثر سے آگاہ شخص پر یہ حقائق مخفی نہیں ہیں مگر ان کی شخصیت سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے

کہ اتنی زبردست صلاحیتوں کے بعد بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں معزول کر دیا؟ یہ بڑا نازک مسئلہ ہے' بہت سی زبانیں اس بارے میں بدگوئی' بیہودہ گوئی اور بلا سمجھے بوجھے رائے زنی میں مبتلا ہو چکی ہیں' بہت سارے قلم خواہشِ نفس کی پیروی اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے جہل و ضلالت کی اندھیاریوں میں بھٹکتے رہے اور زہر آلود تحریریں لکھ کر گناہ جمع کرتے رہے ہیں' حقیقتِ حال یوں ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کسی ناراضگی' بد دیانتی' بغض و عداوت اور کینہ و انتقام کی وجہ سے معزول نہیں فرمایا تھا' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کے لئے بڑی محبت و احترام تھا' وہ ان کے مرتبہ و مقام اور درجہ و رتبہ سے واقف و آگاہ تھے' مگر چونکہ ان کا معزول کیا جانا اس وقت کا دینی و اخلاقی مطالبہ و تقاضا بن چکا تھا۔ اسی لئے سیدنا خالد ابن الولید کو معزول کیا گیا' گویا اس کے ذریعہ راہِ اسلام میں ان کی قربانی پیش کی گئی کہ یہ قربانی مطلوب تھی۔ یہ بات گو عجیب و غریب لگے مگر ہے بالکل درست و بجا۔ فی الواقع اسلام کی اساس و ستون توحید خالص پر ہے' اسلام کا یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نفع و ضرر کا مالک ہے۔ ہر چیز اس کے قبضۂ قدرت میں ہے' دینے لینے کرنے نہ کرنے اور منع و عطا کا سارا اختیار اسی کو حاصل ہے' اسی لئے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں اس عقیدے کی لو مدھم نہ پڑ جائے اور مسلمان سیدنا خالد رضی اللہ عنہ پر بالکل یقین و اعتماد اور مکمل تکیہ و بروسہ کر بیٹھیں اور یہ سمجھ لیں کہ ان کو سیدنا خالد رضی اللہ عنہ ہی کی وجہ سے مدد و فتح میسر آتی ہے اس طرح وہ راہِ راست سے بھٹک جائیں اور فتنوں میں مبتلا ہو جائیں اور سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کی عدم موجودگی میں اسی احساس کی وجہ سے وہ مغلوب و رسوا ہو جائیں۔ ان ساری مصلحتوں کے پیش نظر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا خالد کو معزول کر دیا' اور اس حقیقت کی وضاحت خود اپنے اس فرمان میں کر دی جو انہوں نے مختلف علاقوں میں روانہ فرمایا کہ میں نے خالد کو ناراضگی' عتاب' بد دیانتی کی وجہ سے معزول

نہیں کیا ہے' مگر بات یہ ہے کہ لوگوں کے مبتلائے فتنہ ہونے کا اندیشہ تھا' لوگ ان پر مکمل بھروسہ اور توکل کرنے لگے تھے تو میرے دل نے یہ آواز دی کہ اللہ کی وحدانیت و صناعی و قدرت کا یقین ان کے دلوں میں راسخ کیا جائے اور فتنوں کا نشانہ بننے سے انہیں روکا جائے۔

لٰہذا جو کوتاہ بیں معزولی کے اس معاملہ کو بڑی اہمیت دے کر اسے سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کی خاطر شکنی' ان سے عداوت' ان کے فضل ولیاقت سے انکار و بغض پر محمول کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کے مآثر و کارناموں کا انہیں بڑا بدترین صلہ دیا ہے

جزیٰ بنوہ أبا الغیلان عن کبر
بحسن فعل کما یجزیٰ سنمار

''ابوالغیلان کو اس کے بیٹوں نے بڑھاپے میں اس کے حسن کارکردگی کا ویسا ہی صلہ دیا جیسا کہ سنمار نامی بے نظیر معمار کو دیا گیا تھا''۔

تو بلاشبہ یہ اس کی لاعلمی' نادانی اور اخلاق اسلام سے ناواقفیت کا بین ثبوت ہے اور اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کو حبِ جاہ میں مبتلا سمجھتا ہے کہ ان کا قتال و جہاد امارت و قیادت کے منصب کی وجہ سے تھا' جب امارت گئی تو انہوں نے یہ فرض چھوڑ دیا' یا یہ کہ ان کا قتال بادشاہ و خلیفہ کی رضا جوئی' تمغہ و اعزاز کی حرص' منصب و عہدہ کی خواہش کے لئے تھا' جب خلیفہ نے ان کی آرزو پوری نہ کی اور معزول کر دیا تو وہ جنگ سے کنارہ کش ہو گئے یا انتقامی کارروائی کے لئے میدان میں آ گئے' جیسا کہ غیر مسلم کمانڈر کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ واقعہ اس کے برعکس ہے جو کوتاہ بینوں کی آنکھوں سے اوجھل ہے کہ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ' ثواب و اجر کا حصول تھا' چاہے یہ مقصد عام لشکری کی حیثیت سے پورا ہو چاہے قائد و کمانڈر کی حیثیت سے۔ شاید ان کوتاہ نظروں تک سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کا وہ معرکۃ الآراء تاریخی جملہ نہیں پہنچا جو

سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کی زبانِ حق ترجمان سے اس وقت نکلا تھا جب معزولی کا پروانہ ان کو ملا تھا:

واللّٰہ لو ولیّ علیّ عمر ﷺ امرأۃ لسمعت و أطعت !!

''اللہ کی قسم! اگر عمر رضی اللہ عنہ میرے اوپر کسی عورت کو بھی امیر بنا دیں تب بھی میں سمع و اطاعت کروں گا''۔

اللہ اکبر! قربان جایئے اس پاکیزگی اور جذبہ اشاعت و اقامت دین پر، یہ صحابہ کرام مقدس جماعت ہے، یہ حزب اللہ ہے، یہ انہیں کے پاکیزہ قلوب و نفوس ہیں، ان کی حقیقت و ماہیت تک رسائی ہم جیسوں کے بس کی نہیں۔ یہ ان رفعتوں و عظمتوں پر فائز ہیں جن کا تصور بھی ہم نہیں کر سکتے۔ ہم جوان بلندیوں کے لئے سر اٹھائیں تو ہمارے سروں کی کلاہ بھی گر جائے اور ان کی عظمتوں کا اندازہ نہ ہو سکے۔ کوئی حرج نہیں اگر ہم یہ نہ سمجھ سکیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عام مصلحت کو ترجیح دیتے ہوئے سیدنا خالد کو معزول کر دیا جب کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ قسم بھی کھائی کہ وہ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ سے بڑی محبت رکھتے ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ وہ اپنی قسم میں سچے تھے اور سیدنا خالد رضی اللہ عنہ اس معزولی پر کیسے رضا مند ہو کر عام سپاہی بن کر اسی طرح لڑتے رہے جیسے کمانڈر ہو کر لڑا کرتے تھے؟ اگر مغربی مفکرین اور مستشرقین اس راز سے آشنا و آگاہ نہ ہو پائیں اور اس حقیقت کو سمجھ نہ پائیں تو کوئی تعجب نہیں۔ کیونکہ اس معاملہ کا تعلق ان مردانِ باصفا سے ہے جن کی زندگی کا معیار یورپ میں بسنے والے ترقی یافتہ انسانوں کے معیار زندگی سے بالکل مختلف و جداگانہ ہے۔ یہ مسئلہ ان اصحاب حق کا ہے جو بجا طور پر فرسٹ گریڈ (First Grade) کے لوگ تھے اور تاریخ ان کی نظر نہیں لا سکتی۔

عراق اسلامی پرچم تلے

سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو بڑی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا' انہوں نے مکمل طور پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا نمونہ پیش کیا ان کے پاس بطور ہدیہ طعام پیش کیا گیا تو انہوں نے ہدیہ قبول کرنے کو اس شرط پر موقوف فرما دیا جب تک کہ ہر لشکری کو ویسا ہی ہدیۂ طعام نہ دیا جائے۔ ان کی یہی مخلصانہ و بے لوث کاوش و سادگی رنگ لائی اور اللہ نے ان کے ہاتھوں لشکرِ اسلام کو بڑی بڑی فتوحات سے نوازا' مگر ایک معرکہ میں ان کی شہادت اور اقدامی کارروائیوں کا سلسلہ موقوف ہو جانے کا صدمہ و سانحہ بڑا ہی ہولناک تھا' جسر کے معرکہ میں انہوں نے اور بہت سارے جانبازوں نے جامِ شہادت نوش کیا' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دل و دماغ پر یہ ہوشربا خبر بجلی بن کر گری اور بڑی اذیت کا باعث بنی' کیونکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہِ دور رس میں ایک لشکری کا مرتبہ پورے پورے خزانوں اور ذخیروں پر بھاری تھا۔ اسی المناک حادثہ کی ٹیس اور غم و رنج کے انبوہ کثیر نے مکمل ایک سال تک عراق پر کوئی مہم روانہ کرنے سے روکے رکھا' پھر ان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وعدۂ فتح یاد آیا' چنانچہ انہوں نے کمرِ ہمت کسی' پختہ عزم و ارادہ کر کے پھر سے لوگوں کو فارس پر حملہ کرنے کی دعوت دینے لگے' جب لشکرِ اسلام تیار ہو گیا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ انہیں لے کر مقام صرار میں آئے پھر لوگوں سے مشورہ کیا کہ کیا ان کا مدینہ میں قیام مناسب ہے یا میدان کارزار میں جانا؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی یہ عادت تھی کہ وہ ہر چھوٹے بڑے مسئلہ کو طے کرنے سے پہلے ساری صورتحال مجلس شوریٰ کے سامنے رکھ کر مہاجرین و انصار کے ارباب حل و عقد

سے مشورہ فرمایا کرتے تھے پھر یا تو ان کی آراء کو مان کر عمل کرنے لگتے یا اپنی رائے و تجویز ان کے سامنے بڑی وضاحت سے بیان فرماتے تھے اور بحث و تمحیص کے بعد مسئلہ حل ہوتا تھا' گویا جمہوریت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی فطرت و طبیعت اور اصلیت و خلقت میں رچی بسی ہوئی تھی' جس میں تکلیف و تصنع اور بناوٹ کا دور دور تک نام ونشان بھی نہ تھا' چنانچہ امت کے نمائندوں اور ارباب حل وعقد نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے مدینہ میں قیام اور اپنی جگہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو کمانڈر تجویز کرنے کا متفقہ فیصلہ کر دیا' اگر ہم آپ اس وقت موجود ہوتے جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کمانڈروں کو متعین و نامزد کر رہے تھے اور انہیں ان لشکروں کی امارت کی ذمہ داری سونپ رہے تھے جو دنیا کو فتح کرنے کے ارادہ سے جا رہے تھے۔ تب تعجب وخوف کا ہم آپ پر غلبہ ہو جاتا اور کہہ پڑتے کہ یہ کوئی قیادت ہوئی؟ قیادت مستقل ایک فن ہے' اس کے کچھ قاعدے وضابطے ہیں' کچھ اصول وفروع' کلیات و جزئیات ہیں' قیادت کا مستحق وہی ہو سکتا ہے جو ان قواعد وضوابط پر پورا اترتا ہو اور تمام اجزاء و اصول کا لحاظ کرتا ہو۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کی کیا اہمیت ہے؟ وہ رستم اور رستم جیسے دوسرے کمانڈروں اور سپہ سالاروں کے مقابلہ میں کیا کر سکیں گے؟

مگر حالات کچھ اور منظر پیش کرتے ہیں۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ منصب قیادت پر متمکن اپنی فوجوں کو لے کر دشمن کے مقابلہ میں آتے ہیں' گھمسان کی لڑائی ہوتی ہے اور اس ناقابل تصور فتح وکامرانی کا نقشہ سامنے آتا ہے جس کے سامنے ساری باطل قیادتیں مغلوب وسرافگندہ ہو جاتی ہیں' مورّخین کی آنکھیں اس محیّر العقول واقعہ پر خیرہ ہو جاتی ہیں' لشکرِ اسلامی غالب و فاتح بن کر قدم بڑھاتا ہے۔ اس وقت قادسیہ کا معرکہ بپا ہوتا ہے' تب انہیں سعد کی بے مثال قائدانہ صلاحیت و جوہر کھلتے ہیں' یہ وہی سعد ہیں جنہوں نے نہ کسی فوجی اسکول

میں تعلیم حاصل کی اور نہ ہی فوجی ڈگریاں حاصل کیں۔ مگر وہ قادسیہ کے اس عظیم معرکہ کے ہیرو نظر آتے ہیں' جبکہ قادسیہ تاریخ کے فیصلہ کن معرکوں میں سب سے زبردست معرکہ شمار ہوتا ہے جس نے اس وقت کی شہنشاہیتوں میں سے سب سے سپر پاور سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور حق کا پرچم ہر جگہ لہرادیا' ابوعبیدہ' مثنیٰ اور نعمان کی حیات میں اس طرح کے کارنامے بہت ہیں مگر اس نوعیت کا معرکہ اور غلبہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے' یہ کوئی تعجب خیز بات اور کوئی خارقِ عادت چیز نہ تھی' کیونکہ یہ سب کے سب دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی "جامعة الإسلام" کے طلبہ اور سب سے بڑے معلّم نبی اکرم ﷺ کے شاگرد و فیض یافتہ تھے نبی کریم ﷺ نے نہایت توجہ و اہتمام سے ان کی تربیت کی تھی اور تعلیم دی تھی۔

خلیفۂ دوم کا مثالی و معیاری نظم و نسق

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ صرف شہری حاکم ہی نہ تھے بلکہ ہر میدان میں ہر موڑ پر مسلمانوں کے لشکروں کے قائد و سربراہ بھی تھے' لشکروں کو منتخب کر کے روانہ کرنا' ان کا راستہ تجویز کرنا' خوراک و رسد' سامانِ ضرورت و رقم سے ان کا تعاون و تقویت' ان کی ہر ہر نقل و حرکت سے باخبری و آگاہی سب کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے' مورخِ طبری کے بیان کے مطابق سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنے روانہ فرمائے ہوئے سپہ سالاروں کی ہر ہر نقل و حرکت سے مکمل واقف و آگاہ رہتے تھے' ان کی رائے و مشورہ کے بغیر سپہ سالار کوئی قدم آگے نہ بڑھاتے تھے۔ چنانچہ ابھی سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نجد کے آخری علاقہ شراف کے پاس پہنچے ہی تھے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا مکتوبِ گرامی آ گیا جس میں تمام نقل و حرکت سے آگاہی کے بعد لشکر کو اوّلاً دس حصوں میں تقسیم کر کے ذمہ داران سرپرست متعین کرنے پھر ہر حصہ کو الگ الگ متعدد ٹولیوں میں بانٹ کر کمانڈر و سالار طے کرنے کی ہدایات تھیں' سیدنا سعد رضی اللہ عنہ آگے تھوڑی دور چلے کہ دوسرا مکتوب آ گیا جس میں راستہ کے تمام نشیب و فراز' لائق قیام مقامات' صحیح راستہ' راستہ کی پوری تفصیل و کیفیت' دشمن کی نفسیات و اخلاق' داؤں پیچ' تدبیر و سیاست اور طرز و انداز سبھی کی پوری وضاحت و تفصیل تھی' ساتھ ہی یہ حکم بھی تھا کہ فلاں مقام سے گزر کر فلاں راستہ سے نکلیں' فلاں علاقہ و قصبہ اور صحرا کے بیچ اپنا قلعہ بنائیں پھر اپنے استحکامات پر توجہ دیں' طاقت مجتمع کریں وہاں سے اس وقت تک نہ نکلیں جب تک کہ دشمن اپنی طاقت و جمعیت لے کر نہ آئے' جب

دشمن آئے تو اس پر یکبارگی ناگہانی حملہ کر دیں اور دھاوا بول دیں' اگر اس حملہ میں کچھ فائدہ مسلمانوں کو پہنچے تو یہ آگے فتح کی ضمانت ہے کیونکہ دشمن کی طاقت کا ایک وافر حصہ ضائع ہو چکا ہوگا' اب اگر اس کے پاس بچی کھچی طاقت باقی بھی ہو تو اس کا اصل حصہ اور جوہر و حوصلہ ضائع ہو چکا اور ہمت پست ہو چکی ہوگی۔ اور اگر مسلمان اس حملہ میں مغلوب ہو جائیں تو دشمن کے صحرا کا رخ کر کے ان کی واپسی کے سارے خطوط و نشانات ذہن نشیں کر لیں اور اپنے پیچھے لگے ہوئے ان دشمنوں کی ٹوہ میں لگ کر انہیں نشانہ بنائیں جو مسلمانوں کو گمراہ و ہلاک کرنے کے درپے ہیں۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا طریقۂ کار اپنے دور خلافت کے تمام معرکوں میں یہی رہا' آپ ہی تمام منصوبہ بندی کرتے' جگہوں کی تعین و حد بندی کرتے' اپنے سے ہزاروں میل دور جنگل و صحراء میں مصروفِ عمل لشکر سے مکمل رابطہ و تعلق رکھتے جیسے کوئی زمانۂ حال کا کمانڈر ہو جس کے سامنے پورا جنگی نقشہ و جغرافیہ ہو' ایک ہاتھ میں سرخ قلم ہو اور دوسرے ہاتھ میں الیکٹرانک فون۔ بخدا! حیرت و تعجب ہے' یہ کونسی عبقریت و نبوغ ہے جس کے سہارے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ جیسے دور افتادہ علاقہ میں مسجد الرسول میں تشریف فرما ہیں اور مسلسل تین عالمی جنگی معرکوں کی سپہ سالاری کے فرائض انجام دیے رہے ہیں۔ اور بلادِ افغانستان سے لے کر طرابلس غرب تک محیط زبردست جنگوں کی سربراہی فرما رہے ہیں۔ اس حقیقت سے اغماض و اعراض کی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی کہ ان فتوحات کا سارا سہرا صرف اور صرف بلا واسطہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے سر جاتا ہے۔ وہ صرف عہدہ کے صدر نہیں تھے جیسا کہ ہمارے زمانہ کے بادشاہوں اور صدور کا حال ہے' وہ اسلامی افواج کے حقیقی قائد و سربراہ و نگراں اور محرک اوّل تھے۔ مورخ طبری کا بیان ہے کہ انہوں نے لشکر کا کوئی بھی مسئلہ باقی نہ

رکھا بلکہ اس کی ذمہ داری کسی نہ کسی کے سپرد کی اور پھر اسے مسئول عند الخلیفہ بھی قرار دیا' کوئی معاملہ تشنہ نہیں چھوڑا' یہاں تک کہ غنائم کی تقسیم کرنے والے اور ائمہ و واعظین تک بھی متعین فرما دیئے۔ ان سب ذمہ داریوں کے علاوہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس وقت کی قانون ساز کمیٹی کے ذمہ دار اعلیٰ بھی تھے' قوانین کی وضع و تدوین' کتاب و سنت سے اجتہاد و استنباط کا کام بھی کرتے' ضوابط و قوانین نافذ کرتے' داخلی امور کی ذمہ داریوں کی انجام دہی کرتے ہوئے والیوں اور انتظامی عملہ کی تعیین کرتے' ان کو روک ٹوک' امر و نہی' باز پرس اور نگرانی سب فرماتے' عدلیہ کی ذمہ داریاں انجام دیتے ہوئے قاضیوں کو متعین کرتے' انہیں قضا کے اصول سکھاتے' وعظ و ارشاد کرتے' رفاہ عام کے شعبہ میں آ کر راستے بنانے' سرنگیں' خندقیں اور کھائیاں کھودنے' نہریں بنانے کی ذمہ داری نبھاتے' پھر ان سب کے علاوہ امامت' امارتِ حج' خطبہ' برموقعہ فتوی دہی' فریقین میں مصالحت و عادلانہ فیصلے کا سارا بار ان کے کاندھوں پر مستزاد تھا' محتسب کی ذمہ داریوں کو انجام دیتے ہوئے وہ بازاروں میں جا کر نرخ متعین کرتے' مارکیٹ کا ریٹ طے فرماتے' حد بندی کرتے' ان سب کے ساتھ ہی آپ ان خواتین کے گھروں پر جا کر دستک دیتے جن کے شوہر میدان جنگ میں ہوتے۔ ان سے ضرورت کے بارے میں سوال کرتے اور پھر ان کی باندیوں و بچیوں کو ساتھ لے جا کر ان کا مطلوبہ سامان خرید کر دیتے' اگر کسی خاتون کے پاس رقم نہ ہوتی تو آپ اپنے پاس سے خرید کر عطا فرماتے اور اگر ڈاک آتی تو ان کا خط لے کر ان کے گھر جاتے اور دروازے کے باہر سے ان پڑھ خواتین کو ان کا خط سناتے۔ ساتھ ہی چوری کے اندیشہ کے پیش نظر آنے والے قافلوں کی نگرانی و پہرہ داری بھی کرتے' صدقہ کے اونٹوں کا علاج و معالجہ' بوڑھیوں کی خدمت اور اپنی پشت پر خود آٹا لاد کر بھوکے بچوں کو کھلانے

اور شکم سیر کرنے کا کام بھی کرتے، تپتی دھوپ، سخت گرمی، تیز آندھی وسخت ہوا میں مصروفِ عمل رہتے، پھر بھی بیت المال سے صبح و شام کی خوراک، گرمی جاڑے کے لئے ایک ایک قمیص کے سوا کچھ نہ لیتے۔ مگر پھر بھی یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ شاید حق ادا نہ ہو سکا۔

اکثر اس خوف سے رویا کرتے کہ کہیں رعایا کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ ہوگئی ہو۔ کہیں بیت المال سے ضرورت سے زائد نہ لے لیا ہو۔ یہ ہیں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جن کی عظمت کے تذکرے ہر زبان پر ہیں۔ جن کی جلالتِ شان کے چرچے زباں زدِ خاص و عام ہیں۔ اگر جن وانس ان پر فخر کرتے ہیں تو بالکل بجا ہے اور حق ہے۔

رحم دل اور مہربان حکمراں

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا سعد کو لشکر دے کر روانہ فرمادیا پھر انتہائی بے چینی سے خبر آنے کا انتظار فرمانے لگے' فتح کی خبر آنے میں تاخیر ہوئی تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مضطرب ہو گئے اور کرب و بے چینی نے انہیں گھیر لیا' ان کی مثال اس بے خود و دل گرفتہ باپ کی سی ہو گئی جو اپنے جگر گوشہ کی خبر معلوم کرنے کو بے تاب ہو' اور اس پریشان مادرِ مہربان کی سی ہو گئی جو اپنے اکلوتے کا حال جاننے کے لئے بے چین ہو۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہر صبح قاصد کے انتظار میں حرہ کے اطراف میں نکل جاتے' صحراء میں بے دھڑک گھس کر انتظار فرماتے' افق پر نگاہیں جمائے رکھتے کہ شاید کوئی پیغام رساں آ کر لشکر کا پتہ دے' زمین تپنے اور دھوپ کی شدت پھیل جانے تک وہ انتظار کرتے رہتے' پھر مدینہ لوٹ آتے اور دوسری صبح آنے کا انتظار کرتے تاکہ پھر جائیں اور کوئی خبر ملے یا مخبر ملے' ان کو بالکل قرار نہ تھا' اور قرار آتا بھی کیسے جبکہ مسلمانوں کی افواج روئے زمین کا سب سے گھمسان کا تاریخی معرکہ لڑ رہی تھیں' کسریٰ کی شہنشاہیت پر دھاوا بول چکی تھیں' فارس کو فتح کرنے کے لئے جان توڑ کاوش کر رہی تھیں' یہ کوئی معمولی بات اور آسان معاملہ نہ تھا' بلکہ یہ روئے زمین کی سب سے بڑی جنگی و عسکری طاقت سب سے زبردست و مضبوط سلطنت سے اللہ کے چند مخلص بندوں کا مقابلہ تھا۔ اب اس معرکہ میں اللہ نے ان مخلصین کو کامرانی عطا فرمائی یا انہیں شکست و ریخت کا سامنا ہوا۔ یہی سب جاننے کے لئے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بے تاب تھے' ان کی فکر کا محور یہی مسئلہ بن چکا تھا' ان کو کسی پل چین و قرار نہ تھا۔ ایک روز

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ صحراء کے کنارے روزانہ کی طرح کھڑے منتظر تھے کہ دور دراز افق پر عراق کی طرف سے انہیں ایک شہ سوار آتا دکھائی دیا۔ وہ فتح کی خوشخبری لا رہا تھا یا ہزیمت کی خبر! سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے قابو سے باہر ہو کر اپنی جگہ چھوڑ کر اس کی طرف دوڑ لگا دی، اس کے قریب آنے پر خبر معلوم کی تو اس نے مختصراً اپنی فتح اور دشمن کی ہزیمت کی خبر دی، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا چہرہ کھل اٹھا، سرور و خوشی ان کے انگ انگ میں پھوٹ پڑی، آپ اس کے پہلو میں خبر معلوم کرتے ہوئے چلتے رہے اور وہ شہسوار گھوڑا دوڑاتا رہا، اور بڑی بیزاری سے مختصر جوابات دیتا رہا اس کو اس سائل کی پرواہ وفکر نہ تھی، اس کا مقصود تو امیر المومنین کو خوشخبری دینا تھا اسے اس سائل سے کیا مطلب؟ جب یہ دونوں مدینہ میں گھسے اور قاصد نے لوگوں کو اپنے سائل سے سلام کرتا، مبارکباد دیتا اور امیر المومنین کہتا سنا تب اس کا دل گھبرا اُٹھا، خوف کے مارے کلیجہ منہ کو آ لگا اور وہ اتر کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے معذرت کرنے لگا، اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی، اس کو خوف تھا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس کو اس کی بے رخی و بے توجہی اور لاپروائی پر سزا دیں گے مگر عظمتِ عمری رضی اللہ عنہ ان سب سے بلند تر تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی و دلاسا دیا اور کہا: **لا علیک یا اخي**. ''کوئی بات نہیں بھائی''۔

اسلامی لشکر کی بے مثال امانت داری

آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ انتہائی بدحال و مفلس' فاقہ کش و قحط زدہ' کھال اور چمڑے تک کھا جانے والے عرب بدو روئے زمین کے سب سے بیش بہا ذخیرہ وخزانہ کے مالک ہو جانے کے بعد کیا کریں گے؟ کسریٰ کے خزانوں' اس کے ہیرے جواہرات اور مال و دولت پر غالب ہونے کے بعد اور منجانب اللہ اس کے استعمال کے حلال و مباح ہو جانے کے بعد وہ کیسا برتاؤ کریں گے؟ آپ تصور کیجئے کہ اگر کوئی فوج اس اسلامی فوج کی جگہ ہوتی تو وہ کیا کرتی؟ آج کے ترقی یافتہ ملک کا ترقی یافتہ لشکر کیا کچھ نہ کرتا؟ کیا آپ ہزار میں بھی ایک ایسی مثال لا سکتے ہیں کہ کوئی مفلس و نادار ہو اور وہ لاکھوں کی مالیت کے جواہرات کا مالک بن بیٹھے پھر اس کے اس عمل کی کسی کو خبر و اطلاع بھی نہ ہو کیا ایسے حال میں اس کا جذبۂ امانت و دیانت بھڑک اٹھے گا اور سرکاری ذمہ دار و عہدہ دار تک اس مالک کو پہنچانے پر آمادہ کر سکے گا؟ نہیں! مگر اسلامی لشکر میں ایسے بے شمار نظائر موجود و شاہد عدل ہیں۔ چنانچہ آپ مدائن کی فتح کا واقعہ پڑھ جایئے۔ لشکرِ اسلامی مدائن میں پہنچ چکا ہے۔ مالِ غنیمت جمع ہو رہا ہے۔ لوگ سارا مال اس محکمہ کے ذمہ دار کو بلا پس و پیش دے رہے ہیں کہ اچانک ایک شخص ہاتھ میں ایک برتن لئے آتا ہے اور بلا چون و چرا حوالے کر جاتا ہے۔ ذمہ داران حاضرین اس برتن کے اندر دیکھ کر دہشت زدہ و ششدر رہ جاتے ہیں اور بے اختیار کہہ پڑتے ہیں' اس جیسا مال ہم نے آج تک نہ دیکھا' ہمارے پاس جمع شدہ اموال کی تو اس کے سامنے کوئی حقیقت ہی نہیں' وہ تو اس

کے پاسنگ کو بھی نہیں پہنچ سکتے' کیا تم نے اس میں سے کچھ حصہ لے رکھا ہے؟ تب وہ شخص بول اٹھتا ہے۔ سنو! واللہ اگر اللہ تعالیٰ کا خوف دامن گیر نہ ہوتا تو میں ہرگز یہ تمہارے سپرد نہ کرتا اور واقعی وہ سچا تھا' ورنہ اس ہنگامہ اور شور وغل میں اور اس ہجوم و ازدحام میں اللہ کے سوا کون کسے دیکھ رہا تھا اور کون کس کے پیچھے لگا ہوا تھا؟ تب ان حاضرین نے کہا' تم بڑے عظیم المرتب انسان ہو' تمہارا تعارف؟ مگر اس نے جواب دیا' نہیں میرا تعارف جان کر تم کیا کرو گے؟ میں نہیں بتاؤں گا ورنہ تم میری مدح و تعریف کرو گے جس کا میں خواہاں نہیں' میں اپنے پروردگار کا ثنا خواں اور اس کے اجر و ثواب پر راضی و شاداں ہوں۔

یہ ایک نمونہ ہے اسلامی فوج کی امانت و دیانت کا' یہ ایک یا دو کا طرزِ عمل نہیں ہے' پورا کا پورا لشکر اسی قالب میں ڈھلا ہوا تھا اور اسی طور و طرز پر کار بند تھا۔ اس لشکر کی امانت و پاکیزگی' عفت و دیانت کے لئے مندرجہ ذیل تین تصدیقات و شہادت کافی ہیں۔

① اسلامی فوج کی سب سے بڑی ٹولی کے قائد سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی شہادت۔ انہوں نے فرمایا کہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی قسم' ہم نہیں جانتے کہ قادسیہ کے مجاہدین میں سے کوئی اجرِ اخروی کے علاوہ کسی دنیوی منفعت کا خواہاں رہا ہو۔ تین آدمیوں کے بارے میں کچھ بدگمانی تھی مگر صورت حال منکشف ہو جانے کے بعد ہمیں ان جیسا زاہد و امین نہ مل سکا۔ ① طلحہ بن خویلد۔ ② عمرو بن معدیکرب۔ ③ قیس بن مکشوح رضی اللہ عنہم۔

② لشکر کے قائد اکبر و کمانڈر سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بیان۔ انہوں نے فرمایا کہ بخدا پورا لشکر امانت و دیانت کا نمونہ تھا۔ اگر اہلِ بدر کو منجانب اللہ سبقت و افضلیت کا شرف نہ ملا ہوتا تو میں افواجِ قادسیہ کو اہلِ بدر سے افضل قرار دے دیتا' میں نے بہت سی قوموں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے جمع

کردہ غنائم میں کیسی کیسی بے اعتدالیوں و بے راہ رویوں کا شکار ہوئی ہیں۔

مگر اہل قادسیہ کے بارے میں میں نے ایسا کچھ نہ سنا اور نہ محسوس کیا۔

③ تیسری شہادت امیر المومنین اور اسلامی فوج کے نگرانِ اعلیٰ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب کی ہے۔ جب کسریٰ کی تلوار لے کر قاصد ان کے پاس آیا تب انھوں نے فرمایا: بلاشبہ جن لوگوں نے یہ سب اموال بیت المال کو پہنچائے وہ یقیناً ایمانت و دیانت کے مرتبۂ علیا پر فائز ہیں۔ تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ آپ پاکیزگی وعفت کے شاہکار ہیں اسی لئے آپ کی رعایا بھی عفیف و پاکباز ہے۔ (طبری جلد ۶ ص ۱۷۷)

سیرتِ فاروقی میں غایت شفقت و تواضع کے جلوے

چرخِ نیلی فام نے بہتیرے مخلص لیڈروں کو قیادت و امارت کے منصب پر جلوہ افروز ہونے کے بعد بدلتے' ناحق تکبر کرتے اور بیجا سرکشی کرتے ہوئے دیکھا ہے' تاریخ گواہ ہے کہ بہت سے خود کو بے لوث ظاہر کرنے والے زعماء جب کرسیٔ ریاست پر متمکن ہوئے تو ان کے شب و روز بدل گئے' ان کی عادات و اطوار میں فرق آ گیا' ان کا رنگ ڈھنگ تبدیل ہو گیا' بلند و بالا قلعے و محلات' بیشمار جائدادیں اور بے انتہا ساز و سامان انھوں نے اکٹھا کر لیا۔ دنیاوی عیش کوشیوں' لطف اندوزیوں اور لذت پرستیوں میں وہ پور پور ڈوب گئے۔ تاریخ میں ایسے لاتعداد واقعات موجود ہیں۔ ہم یہ دیکھنے اور سننے کے عادی ہو گئے ہیں کہ جہاں کسی کو کوئی چھوٹا سا عہدہ ملا' کوئی ادنیٰ سا منصب نصیب ہوا وہاں اس کی دنیا یکایک بدل جاتی ہے۔ تو اب ہم کیسے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی عظمت پر قربان نہ ہوں اور کیسے ان کی شخصیت کی تقدیس و تعظیم نہ کریں۔ جبکہ وہ اپنے زمانہ میں سب سے عظیم فاتح و قائد کے منصب پر فائز ہو چکے تھے۔ سب سے بلند عہدہ ان کو مل چکا تھا مگر ان میں کوئی تبدیلی و انقلاب نہ آیا' اس عہدہ سے انھوں نے کوئی ذاتی نفع و فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اپنے طور وطریقہ' خوراک و پوشاک' چال چلن' ذمہ داریوں و مشغولیتوں اور تواضع و بے نفسی میں سابقہ حالات پر باقی رہے' سفر و حضر میں بلا پہرہ و پردہ تن تنہا رہنا ان کی اخیر تک عادت رہی' حکومت و خلافت نے ان میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کی اور نہ بے بہا خزانوں و جائیدادوں نے ان کو تکبر و غرور میں مبتلا کیا۔

آپ صرف اس موقعہ کی یاد تازہ فرما لیجئے جب کہ بڑے بڑے انصاف گستر و عدل پرور بادشاہ اور بہت زیادہ سیکولر و جمہوریت پرست امراء بھی تکبر و غرور، تعلّی و کبر اور سرکشی و خود غرضی کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ فتحِ فارس کا واقعہ یاد فرما لیجئے۔ ایران پر اسلامی پرچم لہرایا جا چکا ہے۔ کسریٰ کی ناقابلِ تسخیر سلطنت پاش پاش ہو چکی ہے۔ پورے علاقے پر اسلام کا غلبہ ہو چکا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اس عظیم الشان غلبہ و فتح کی خبر آتی ہے۔ یعنی اعلان ہو جاتا ہے کہ اب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جزیرۂ عرب اور سلطنت شام کے تاجدار ہونے کے ساتھ ہی شہنشاہِ ایران بھی بن چکے ہیں' مگر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بجائے اس کے کہ جلوسِ فتح نکالیں' کبر و غرور اور اپنی برتری کے لئے پورے جلوس کے جلو میں روم کے قائدوں و فاتحوں کا طرزِ عمل اپناتے ہوئے اکڑ کر نکلیں' منبرِ رسول پر چڑھے اور ایک تقریر فرمائی' اس میں انہوں نے اپنی جمہوری سیاست وطریقۂ کار کا اعلان فرمایا' رعایا و عوام کے ساتھ اپنے بے پایاں ربط و تعلق کا ذکر فرمایا' اس کی وضاحت فرمائی کہ وہ قوم پر حاکم نہیں بلکہ قوم کے خادم ہیں۔ حتی المقدور عوام کی ضروریات پوری کریں گے۔ ان کے مسائل سلجھائیں گے' ان کے معاملات حل کریں گے۔ ہاں اگر یہ سب نہ کر سکے تو لوگوں سے ہمدردی و غمخواری کا معاملہ کریں گے' تاکہ معاملہ برابر سرابر ہو جائے' اور ساتھ ہی یہ بھی ذکر فرمایا کہ حاکم لوگوں کی جانوں کا مالک نہیں ہوتا اور قوم حاکم کی غلام و چاکر نہیں ہوتی' بلکہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور حاکم امین ہے۔ اگر امانت میں وفاداری و دیانت کرتا ہے تو وہ کامیاب ہے اور اگر خیانت و بدعہدی کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ بڑے گھاٹے میں ہے۔ یہ ہے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا موقف! کب؟ جب کہ وہ تاریخ کے سب سے بڑے معرکہ میں فاتح بن کر لوٹے۔

خلیفۂ ثانی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی عدیم النظیر تمدنی حکمت وفراست

کفر و ایمان کا معرکہ ہر جگہ گرم ہوتا گیا' باطل طاقتیں پسپا ہوتی رہیں' اسلامی قائدین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا نعرہ لگاتے آگے جاتے رہے' ہر علاقہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا پیغام بڑے شد و مد سے پہنچا اور ہر بار نیا اسلامی لشکر مستعد و آمادۂ پیکار اور دینی جذبات سے سرشار ہو کر مدینہ میں اکٹھا ہوا' یہ چھوٹا سا الگ تھلگ شہر بڑا جنگی مرکز بن گیا جہاں ہمہ وقت نقل و حرکت اور آمد و رفت کا سلسلہ ہی دیکھنے میں آتا' لشکر کے لشکر جمع ہو کر شام و عراق کی طرف اپنے غازی برادرانِ اسلام کے تعاون کے لئے چل پڑتے' بڑی بڑی فوجیں میدانِ جنگ میں اتر کر لشکر منظم کرتی نظر آتیں' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے روز و شب کا ہر ہر لمحہ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے وقف رہا۔ وہ اس خطرناک و ہولناک مہم کی ذمہ داری میں بلاتوقف ہر لمحہ منہمک رہے۔

پھر جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع ہوتا گیا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ مشرقی کنارہ (ایران کی سمت) کے جنگی میدان سے مدینہ کافی دوری کے فاصلہ پر ہے اس لئے فوجی چھاؤنی کا مدینہ میں رہنا مشکل اور جنگی مصالح کے خلاف ہے۔ چنانچہ دو جنگی اڈے بنائے گئے۔ ایک ایران شام اور عراق کی سرحد پر اور دوسرا شام عراق اور جزیرۃ العرب کی سرحد پر روم کے قریب۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی دلی آرزو یہ تھی کہ وہ ان دونوں جنگی چھاؤنیوں کو

مستقل شہر بنا دیں تا کہ پورا علاقہ خالص اسلامی قالب میں ڈھلے اور پروان چڑھے۔ وہ مسلمانوں کو قدیم آبادیوں میں آباد کرنے کے قائل نہ تھے۔ تا کہ ان میں غیروں کی عادتیں اور رسوم جڑ نہ پکڑ سکیں۔ عیش وعشرت' لہو ولعب اور فرح وطرب کی زندگی ان کو بیکار و ناکارہ نہ کر سکے۔ یہ تھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی دور اندیشی' دقیقہ رسی اور بلند فکری۔ چنانچہ ان دونوں شہروں نے اسلامی فتوحات میں بڑا اہم رول اور کارہائے نمایاں انجام دیئے' مشرقی جنگی میدان اور شامی حربی میدان میں رسد اور مدد پہنچنے کا ذریعہ یہی شہر تھے۔ پھر جب جنگی سلسلہ ختم ہوا تب یہ دونوں شہر تہذیب وادب اور علم وفن کے میدان میں سب پر فائق نظر آئے۔ چنانچہ ہر شاعر' ادیب اور عالم کے علم وفن پر کوفہ اور بصرہ کے فضل واحسان کی مکمل جھلک نظر آتی ہے۔ ہر کوئی انھیں میخانوں کا میخوار نظر آتا ہے اور انھیں مراکز کا پروردہ وترتیب یافتہ اور خوشہ چیں۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ
کی
حیرت انگیز عبقریت و جامعیت

کامیابی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے قدم چومے جا رہی تھی' دنیا کی سپر پاور حکومتیں ان کے زیرِ نگیں آ چکی تھیں' کسریٰ کی مستحکم و پائدار سلطنت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زیرِ اقتدار علاقوں میں ضم ہو چکی تھی' مصر و شام ان کی فوج کے بے نظیر عزم و استقامت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر چکے تھے' دنیا کی سلطنتوں میں بازنطینی سلطنت کے سوا کوئی اور سلطنت اسلام کے زیرِ اثر آنے سے باقی نہیں رہ گئی تھی' بازنطینی سلطنت زار و نزار' نحیف و ناتواں' زخمی و شکستہ آخری سانس لے رہی تھی' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا خوف اسے دہلائے جا رہا تھا' دوسری طرف مشرقِ اقصیٰ کے ممالک گوشۂ گمنامی میں تھے جنہیں کوئی جانتا بھی نہ تھا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو جو عظمت و رفعت نصیب ہوئی وہ کسی اور عرب کو نہ مل سکی' ان کے حصہ میں اتنی فتوحات اور کامیابیاں آئیں جو ان کے پیشرو دارا و سکندر کے سان و گمان میں بھی نہ تھیں۔ وہ اس وقت ایک تہائی کرۂ ارض کے بلا شرکتِ غیرے حکمراں تھے۔ غور فرمائیے! وہی شخص جو کوہ صفا کے دامن میں آباد دارالارقم میں غیظ و غضب کے عالم میں سرورِ کائنات جناب محمد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ناپاک عزائم لے کر بے دھڑک گھسا تھا اب وہی شخص نبوت کی معجزانہ تربیت و تاثیر کے نتیجہ میں کسریٰ و قیصر کا حاکم و فاتح بنا دکھائی دے رہا ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ادنیٰ سے حکم واشارہ کی تعمیل افغانستان، طرابلسِ مغرب، یمن، حضرموت، جبالِ طوروس ہر جگہ ہوتی تھی، کوئی حاکم بغاوت و نافرمانی کا تصور بھی دل میں نہ لاتا تھا، کوئی قوم کسی تحریک و انقلاب کا ارادہ بھی نہ کر پاتی تھی۔ پوری دنیا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے طریقۂ کار پر راضی وخوش تھی، ان کے بے مثال عدل وانصاف نے اطمینان وسکون پھیلا دیا تھا، شاہ وگدا ایک صف میں تھے، بکری اور شیر ایک ہی گھاٹ سے سیراب ہو رہے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہی حاکم، قائد، قاضی، سیاسی، عالم، خطیب، امام، واعظ سب کچھ تھے، گویا وہی پوری سلطنت کا لبِ لباب اور حقیقۃ الحقائق تھے۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ دیہات کی عبقریت کے آثار جب نمایاں ہوتے ہیں اور حسن اتفاق سے حالات بھی سازگار ہوتے ہیں تو یہ عبقریت سب سے عظیم و برتر عبقریت کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو یہی عبقریت حاصل تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا نامِ نامی اسم گرامی ان بڑے کمانڈروں میں سرِ فہرست ہے جنہوں نے جنگی میدانوں میں انتظام سنبھالا، لشکروں کی قیادت کی، فوجیں لڑائیں، جنگ کا پانسہ پلٹ دیا، شہر کے شہر فتح کرتے چلے گئے، عزت وشرف، رفعت و ناموری کی بلند چوٹیوں پر چڑھتے گئے، کامیابی اور غلبہ ان کے قدم چومتے رہے، فتح وظفر ان کی حلیف رہی، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی بہت زبردست وعظیم قائد تھے، اگر ان کے پاس صرف یہی ایک صفت ہوتی تب بھی یہ ان کو عظمت و رفعت کی آخری انتہا ومنزل تک پہنچانے کے لئے کافی ہوتی۔ مگر تعجب اس پر ہے کہ یہ تو ان کے متعدد مناقب میں سے ایک منقبت ہے اور یہ تو ان کی عظمت وعبقریت کا ایک گوشہ ونمونہ ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ قانون داں مصلحوں کی صف میں بھی لیکورغ، وجستینان کی طرح نمایاں مقام رکھتے ہیں بلکہ بلا تردّد انہیں عظیم ترین قانون

ساز، باریک بین، صاحب نظر وفکر، قوی الارادہ، فقیہ، عالم اور منتظم کہا جا سکتا ہے اگر ان کے پاس صرف یہی عظمت و منقبت ہوتی تب بھی ان کی رفعت شان کے لئے بس ہوتی مگر باعث تعجب یہ ہے کہ ان کے مناقب میں ایک معمولی منقبت اور ان کی عبقریت کا ایک نمونہ ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا شمار ان جمہوری لیڈروں میں بھی ہوتا ہے جو جمہوریت کے علم بردار اور انصاف و مساوات و آزادی کے برملا مؤید، حقوق قومی و انسانی کے مدافع و پاسبان تھے، بلاشبہ وہ بہت بڑے جمہوری لیڈر اور مخلص و بے لوث قائد تھے جن کی زندگی کا مقصد نوعِ انسانی کی منفعت و سعادت کا ہر لحہ خیال اور شہنشاہیت و ڈکٹیٹر شپ، استبداد و ظلم کا ہر موڑ پر مقابلہ ہی تھا۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تنہا یہی خصوصیت میسر ہوتی تب بھی بہت تھا مگر یہ تو ان کی ایک معمولی سی عظمت اور عبقریت کا ایک چھوٹا نمونہ ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا شمار ان بلند پایہ یکتائے زمانہ ادیبوں میں بھی ہوتا ہے، جن کے زرّیں اقوال، بلیغ خطبے و مکتوبات، درست و عمدہ تنقیدی نظریات و آراء اور بے مثال ولاجواب و کارآمد حکمتیں و مثالیں منقول ہیں، آپ بلا خوفِ تردید انہیں عظیم ترین ادیب کہہ سکتے ہیں، اور اگر آپ غور کریں تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ادبی شہ پارے اتنے زیادہ و بلند پایہ ہیں کہ اگر کسی اور انسان کو یہ میسر آ جائیں تو وہ نادرۂ روزگار اور زندۂ جاوید ادیب بن جائے۔ مگر یہ صفت بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی عظمت و منقبت کا صرف ایک جزء و حصہ ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، اللہ تعالیٰ کے ان نیک بندوں کی صف میں بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں جو دنیا کی رنگینیوں و نیرنگیوں سے کنارہ کش اور مادّیت کی لذتوں وعیش کوشیوں سے نالاں رہتے ہیں جن کی نظروں میں دنیا ذرۂ بے مایہ کی حیثیت رکھتی ہے، جو اپنے ظاہر و باطن کی پاکیزگی، اپنی استقامت و خدا ترسی،

اپنے فضل و شرف اور اتباعِ حق کے لحاظ سے مثالی اور یکتائے روزگار لوگ ہیں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ وصف ان کی امامت و سیادت کے لئے کافی ہے اور اگر اس وصف کے سوا ان کے پاس کچھ نہ ہوتب بھی یہ ان کی عظمت کا عروج ہے مگر تعجب اس پر ہے کہ یہ ان کی عظمت و عبقریت کا صرف ایک حصہ و گوشہ ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ان انسانوں میں تھے جو بکھرتی اور سسکتی انسانیت کے دکھوں کا مداوا اور اپنی شفقتوں و عنایتوں کے درو ا کر دیا کرتے ہیں اور جن کا مقصدِ زندگی انسانیت کی سربلندی و سرفرازی ہوتا ہے' وہ ان نابغۂ روزگار لوگوں میں تھے جو اپنے وقت سے پہلے آتے ہیں اور پھر آئندہ نسلیں ان کو یاد رکھتی ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ساری عظمتوں و عبقریتوں کے جامع تھے۔ سبحان اللہ! قربان جائیے ان عظمتوں پر اور ان نفوس قدسیہ پر۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ عظمتِ و کمال کے سارے منازل و مراحل طے کر چکے تھے۔ اب ان کی زندگی کا مطمحِ نظر صرف جنت تک رسائی تھا' دنیا ان کی نگاہ میں ایک ذرّۂ بے مایہ ہوگئی' دنیا کی ساری چیزیں کمتر و حقیر نظر آنے لگیں کیونکہ وہ ان سب مادی رونقوں سے بلندتر اور روحانی نعمتوں سے سرشار تھے' دنیا میں رکھا ہی کیا ہے؟ مال ہے تو مال تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اتنا آیا کہ انہوں نے اسے ناپ تول کر تقسیم کیا' مال دیکھتے دیکھتے اکتا گئے' مال کی نہ انہیں کوئی آرزو تھی نہ طلب' نہ اس کی کوئی پرواہ و تمنا تھی۔ اگر دنیا میں لعل و جواہر ہیں' تو کسریٰ کے جواہران کے سامنے ڈھیر تھے مگر انہوں نے اس میں سے کچھ نہ لیا اور نہ اس کی کوئی طلب انہیں بے تاب و مضطرب بنا سکی' وہ تو ان چیزوں سے یکسر بے نیاز و فارغ البال تھے اگر دنیا میں مجد و جاہ ہے تو ان کے پاس اتنے مناصب جمع تھے جو پوری ایک امت کے لئے کافی تھے اور اگر دنیا میں لباس و مکان ہے' تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا چھوٹا سا مکان اور ان کا پیوند زدہ لباس دنیا کے سارے

محلات اور ساری پوشاکوں سے عظیم و بلند تر تھا' دنیا کے بڑے سے بڑے امراء ورؤساء سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی اس شانِ فقیرانہ اور درویشانہ ادا کے سامنے ہیچ و بے حقیقت نظر آتے ہیں' آپ ایران کے فرمانروا ہرمز موازنہ کریئے تو نظر آئے گا کہ ہرمز کا مزین و بیش بہا اور یاقوت و زبرجد سے جڑا ہوا تاج اور سنہری دھاگوں سے سلے ہوئے نفیس عمدہ کڑھے ہوئے لباس اور اس کا منصب و عہدہ اور اس کی ساری زینتیں سب کچھ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ایک بوسیدہ و پیوند زدہ کرتے کے مقابلہ میں بے حقیقت و بے اثر ہیں' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا رعب و دبدبہ اور ان کی ہیبت و جلال کے سامنے ہرمز کے سارے مادی ظواہر فیل ہیں' اس کا سنہرا لباس محض سیاہ وعیب دار ہے اور اس کا یاقوت سیاہ و کھوکھلا ہے' بلکہ ہرمز اپنی تمام تر رعنائیوں اور ظواہر کے باوجود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے وہی حیثیت رکھتا ہے جو ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی سورج کے سامنے ہوتی ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ عظمتیں متنوع ہوتی ہیں' بعض عظمتیں تو مانگے ہوئے کپڑوں کی طرح آتی اور فنا ہوتی ہیں۔ یہ وہ عظمت ہے جو محلات و پوشاک تک محدود اور مناصب و عہدوں ہی پر منحصر ہوتی ہے یہی عظمت ہرمز کو حاصل تھی' آپ ہرمز کے جسم سے وہ عمدہ پوشاک اتار کر دیکھئے تو کچھ بھی نہ بچے گا' اگر کسی کمانڈر سے اس کا عہدہ لے لیا جائے تو وہ صرف ایک فوجی ہی رہے گا۔ اس کی قیادت فنا ہو جائے گی' کیونکہ یہ عظمتیں اور ریاستیں ان مادی چیزوں پر منحصر ہوتی ہیں جن کو بہر حال فنا و زوال کا ذائقہ چکھنا پڑتا ہے۔

مگر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو جو عظمت عطا ہوئی تھی وہ ابدی ولافانی تھی' وہ ان کے اندرون کی' ان کے سراپا کی عظمت تھی' ان کے لافانی کارناموں اور بے مثال خدمات کی عظمت تھی اور ایسی عظمت ہمہ وقت باقی رہتی ہے کیونکہ اس کے

اسباب موجود رہتے ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بہمہ وجوہ عظیم تھے' ذاتی خصوصیات و کارنامے' بلند و بالا خدمات و مفاخر' خلقِ خدا کی نفع رسانی و رفاہِ عام ہر لحاظ سے ان کی عظمت حاصل تھی' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے فتح کیے ہوئے علاقے' ان کے بنائے و تعمیر کرائے ہوئے شہر' ان کے وضع کردہ قوانین و دساتیر' ان کے لبِ مبارک سے نکلے ہوئے حکیمانہ کلمات یہ سب ہمیشہ بآوازِ بلند عظمتِ عمری رضی اللہ عنہ کے ترانے پڑھتے نظر آئیں گے۔

یہ ہیں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہ تمام زبانوں میں ان کا نام لیا جاتا ہے' انبیاء و رسل کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سوا تاریخ انسانی میں عمر سے بڑا عظیم و عبقری انسان پیدا نہیں ہوا۔

عہدِ فاروقی کے ہمہ گیر انتظامات و اولیات

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے ذہن رسا اور دور اندیش عقل و دماغ اور اپنی بصیرت کی وجہ سے وہ کارنامے انجام دیئے جن کا اس ماحول میں تصور تک نہ تھا اور جو صدیوں بعد شروع ہوئے' گویا جیسے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس صدی کے انسان نہ ہوں بلکہ بعد کی کسی صدی میں جی رہے ہوں اور اس کے ماحول کے لحاظ سے سوچ رہے ہوں۔ اس طرح کے کارنامے بے شمار ہیں جنہیں آج ہم تعجب و حیرت بھری نگاہوں سے دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔

مثلاً سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جمہوری و عوامی حکومت کے مفہوم سے آشنا ہونے کے بعد جمہوریت کے ان مبادی وقوانین کی تصریح فرمائی جن سے کوئی واقف ہی نہ تھا' بعد میں خونی انقلابات اور لمبی لڑائیوں کے بعد یہ قواعد سمجھے گئے۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان قوانین کو شاہی فرمان وحکم کے طور پر پورے علاقے میں نافذ کر دیا اور عمل درآمد کرا دیا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تاریخِ انسانی کے پہلے حاکم ہیں جنہوں نے ایسا فرمان جاری کیا کہ امراء و حکام عوام کے مالک نہیں ہیں' ان کا عوام کے مال و جسم میں کوئی حصہ وحق نہیں ہے' پوری قوم آزاد ہے' اس کی ضمانت لی گئی ہے' سب کا مال محفوظ ہے' حکام صرف عوام کے معلّم' امام اور خادم ہیں جن کا کام مصالحِ عامہ کی رعایت وانجام دہی' انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے جدوجہد اور قوم و ملت کی خدمت ہے۔ ان سب کاموں کے علاوہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عدالت

کے دروازے ہر شخص کے لئے بے دھڑک کھول دیئے اور سب کو یہ حق دے دیا کہ جس کو کسی حاکم وامیر یا کسی اور سے کوئی بھی شکایت ہو وہ بلا جھجک اپنی شکایت پیش کرے۔ پھر ایسا ہی ہوا اور جب بھی کسی حاکم کے خلاف کوئی مقدمہ پیش ہوا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ رعایا کی صف میں رہے' مسئلہ کی تحقیق کی' بحث وتمحیص کے بعد اگر مدعی حقدار نظر آیا تو اسے اس کا حق دلوا کر حاکم کو معزول کر دیا یا سزا سنائی یا مدعی کو خود بدلہ لینے کا پورا حق فراہم کر دیا' اور اگر مدعی غلط نظر آیا اور یہ تحقیق ہوئی کہ رعایا خود ظالم ہے اور حاکم بے قصور ہے تو ایسے موقعہ پر انہوں نے منصف قاضی کا رول ادا کیا اور پوری طرح عدل وانصاف کیا۔ بلکہ گورنروں اور والیوں کی مخبری اور تحقیق کے لئے ان کے اپنے ایک مخصوص کارندے تھے' محمد بن مسلمہ جنہیں ہمیشہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مختلف علاقوں کے سفر پر بھیجا کرتے تھے جہاں جا کر وہ لوگوں پر ہونے والے مظالم اور شکایتوں کی تحقیق کرتے اور ان کے مطلوبات ومرغوبات کے بارے میں معلوم کر کے ساری تفصیل سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے گوش گزار تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے والیوں کے متعلق سب سے بڑا خطرہ جو تھا وہ یہ تھا کہ کہیں یہ لوگ ولایت کو رعایا کا مال حق سمجھ کر اڑانے اور ناحق خرچ کرنے کا ذریعہ نہ بنا بیٹھیں۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ان کی مالی حالت کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا کرتے تو اگر کسی کو دیکھتے کہ وہ مالدار ہو گیا ہے یا اس نے مال جمع کر رکھا ہے تو اس کا مال آدھا آدھا تقسیم کرتے' آدھا بیت المال میں ڈالتے اور آدھا اس کے پاس رہنے دیتے۔ ان کو یہ اندیشہ لاحق تھا کہ یہ والی حضرات کہیں اپنے اعزہ واقارب کو عام رعایا پر ترجیح نہ دینے لگیں کہ پھر وہ اقارب ڈکٹیٹرانہ وآمرانہ رویہ اختیار کر کے لوگوں پر بیجا ظلم وزیادتی کرتے پھریں اور جو چاہیں کریں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ایسے لوگوں کو بڑی سخت سزائیں دیا کرتے' صحابیٔ جلیل فاتح مصر سیدنا عمرو بن

العاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے کہ جب ان کے صاحبزادے نے کسی مصری کو مارا تھا۔ تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس مصری کو بلا کر پورا حق قصاص برملا عطا فرمایا اور انصاف و عدل کی ایک ناقابلِ فراموش نظیر قائم کر دی اور پھر ایسا تاریخی جملہ فرمایا کہ فرانس کا انقلاب ہزار سال بعد بھی ویسا جملہ نہ دہرا سکا بلکہ ہم بھی اسے دوبارہ نہ کہہ سکے کہ **متی استعبد تم الناس و قد ولدتهم أمهاتهم أحراراً.** تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنالیا جب کہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا؟

اس تاریخ ساز جملہ کی صرف یہ اہمیت نہیں کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد ایسا جملہ کہا نہ جا سکا بلکہ اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس کا کہنے والا کوئی عوامی لیڈر نہیں تھا جو منصبِ وزارت کا آرزومند رہا ہو یا کرسیٔ صدارت پر متمکن ہونے کا خواب دیکھ رہا ہو اور پھر وہ اس منصب کو غریب عوام کے گلوں میں چھری چلا کر اور ان کی گردنوں پر پیر رکھ کر حاصل کر لے بلکہ یہ جملہ اس ہستی کی زبان سے نکلا ہے جو اپنے وقت کا سب سے بڑا فرمانبروا اور لشکرِ اسلام کا چیف کمانڈر تھا۔ کیا آپ نے کبھی ایسی خبر سنی ہے کہ کسی قوم کا فرمانروا کوئی قانون تجویز کرے جس پر عوام نہ بھڑکیں اور لیڈر بے چون و چرا صرف اس کو مان لینے اور تائید کرنے پر آمادہ ہو جائیں؟ نہیں! ہرگز نہیں! مگر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایسا بارہا ہوا ہے اور اس کی داستانیں صفحاتِ تاریخ پر ثبت ہیں۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اور کارنامہ جس کے بارے میں بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت اور اس ماحول میں اس کا تصور بھی نہ تھا بلکہ صدیوں بعد اس کی ابتداء ہوئی۔ یہ کارنامہ ان کی بصیرت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ وہ یہ کہ اس زمانہ میں دنیا میں کوئی ایسی حکومت نہ تھی جو صحراؤں اور جنگلوں کو اپنا مرکزِ توجہ بنائے، اس کی قدر و قیمت سے آگاہ ہو اور اس کی حفاظت و پہرہ داری کا

اہتمام کرے' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایسے زمانہ میں بھی اپنی عقل رسا سے آنے والے مستقبل کے ان زمانوں کو دیکھ لیا جن میں جنگلات کی حفاظت و پہرہ داری کو قابل فخر کارنامہ قرار دیا جا رہا تھا۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس پورے علاقہ پر ایک نگراں و پہرہ دار مقرر فرما دیا' وہاں کے درخت کاٹنے سے روک دیا' اور مخالفت کر کے درخت کاٹ کر لے جانے والے کی سزا یہ تجویز کر دی کہ اس کا پھاوڑا اور رسی ضبط کر کے اسے اس کام سے روکا جائے۔

ان کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے راستوں میں گھوم کر مانگنے پر روک لگا دی' اور محتاج و مجبور مفلس لوگوں کا وظیفہ طے کر دیا جس سے وہ گزر بسر کرتے۔ یہ ایسا کارنامہ ہے جس پر ابھی کچھ دن پہلے ہی حکومتوں کی توجہ مبذول ہوئی ہے۔ نیز مکہ و مدینہ کے درمیانی علاقوں میں بچھڑ جانے والے مجبور انسانوں سے تعاون اور بھوکے پیاسوں کو آسودہ کرنے کے مقصد سے ایسے بہت سے مسافر خانے کھلوا دیئے جہاں سارا انتظام مفت تھا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نظامِ احتساب کی بنا ڈالی' ناپ تول میں کمی اور دھوکے سے سخت ممانعت فرمائی' ناپ تول میں ایک خاص توازن قائم فرمایا' عام گزرگاہوں اور شاہراہوں سے تکلیف دہ چیزیں دور کرائیں شہروں کی صفائی ستھرائی پر خاص توجہ مبذول فرمائی اور سارے وہ کام انجام دیئے جو آج کل میونسپل کارپوریشن کی ذمہ داری سمجھے جاتے ہیں جبکہ اس زمانہ میں کسی بھی حکومت کو اس نظام کے بارے میں کوئی آگاہی نہ تھی۔

ان کا ایک عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کوفہ اور بصرہ جیسے عظیم تاریخی شہروں کی تاسیس کا کام انجام دیا۔ انہوں نے فراست کے نور سے آئندہ کے حالات دیکھ لئے تھے اور یہ اندازہ کر لیا تھا کہ آئندہ یہ شہر مرکزی حیثیت حاصل کر لیں گے اور علم و ادب کا مرکز ثابت ہوں گے۔ چنانچہ

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان شہروں کی منصوبہ بندی بیسویں صدی کے ترقی یافتہ شہروں کے طرز پر فرمائی کہ سڑکوں کی چوڑائی ۴۰ گز سے ۳۰ گز تک رکھی اور عمارت دومنزل یا سہ منزلہ تک ہی بنانے کی اجازت دی تاکہ ہوا نہ بند ہو سکے' گویا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ عمارتوں کے بھی انجینئر تھے۔ ع

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ وہ غیر مزروعہ زمین کو آباد کریں اور بنجر زمینوں کی کاشت کرائیں' چنانچہ انہوں نے شرعی قاعدہ کے مطابق بنجر زمین کو قابلِ کاشت بنانے والے کو اس زمین کے مالکانہ حقوق سپرد فرما دیئے' ان کا مزاج یہ تھا کہ وہ اجتماعی مصالح کو ذاتی مصلحتوں پر ترجیح دیا کرتے تھے' گویا وہ ایک سوشلسٹ مصلح بھی تھے' چنانچہ انہوں نے سیدنا بلال بن حارث مزنی سے وہ پورا قطعۂ زمین لے لیا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جاگیر دی تھی' کیونکہ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ اس کی کاشت پر قادر نہ تھے اور اسے یونہی بنجر و غیر مزروعہ چھوڑ رکھا تھا' اور اس ساری کارروائی میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسلامی عدالت کے قواعد و اصول کو پیش نظر رکھا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی دانشمندی و خردمندی کا ایک نمونہ اس وقت سامنے آیا جب فتوحات کے دائرے وسیع سے وسیع تر ہوتے گئے اور سلطنت اسلامیہ بڑھتی گئی اور متعدد علاقے فتح ہوئے تو یہ مسئلہ سامنے آیا کہ یہ علاقے مال غنیمت ہیں اس لئے انہیں غازیوں میں تقسیم کیا جائے۔ اس موقعہ پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مستقبل کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا کہ اگر شام و عراق و مصر کے یہ علاقے تقسیم کر دیئے گئے تو آنے والی نسلوں کے لئے کیا بچے گا؟ آئندہ آنے والا کیا کرے گا جب وہ دیکھے گا کہ ساری زمینیں تقسیم ہو کر وراثت میں منتقل ہوتی جا رہی ہیں؟ اس لئے انہوں نے سوچا کہ تقسیم کی رائے نامناسب ہے مگر آپ

کے اصحاب نے اس رائے کی تائید نہ کی' چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جبر وزور سے کام نہ لیا بلکہ شوریٰ کی میٹنگ طلب کی' مسئلہ رکھا گیا' سب نے تقسیم کی رائے دی اور موقف عمری رضی اللہ عنہ کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ کیا آپ ان چیزوں سے ہمیں محروم کر کے انہیں وقف کرنا چاہتے ہیں جنہیں ہماری تلواروں کے طفیل اللہ نے ہمیں بخشا ہے' اور یہ چیزیں آپ ان کے لئے اوران کے بیٹوں' پوتوں کے لئے روک رہے ہیں جو جنگ میں حاضر بھی نہ تھے' اس لئے ایسا کرنا بالکل غیر قانونی ہے۔

پھر ممبرانِ شوریٰ نے مطالبہ کیا کہ یہ مسئلہ پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے چنانچہ اسلامی پارلیمنٹ کے ارکان مہاجرین و انصار جمع ہوئے' مسئلہ رکھا گیا' بحث ہوئی' پھر رائے شماری ہوئی تو اکثریت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ نظر آئی' چنانچہ تقسیم سے روک دیا گیا' اور یہ زمینیں حکومت کی ملکیت میں رہیں اور خزانہ عام میں اضافہ کا سبب ثابت ہوئیں' کیونکہ تنہا کوفہ کی زمینوں کا ٹیکس سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی وفات سے پہلے دسیوں لاکھ درہم تک پہنچ چکا تھا۔

حقِ خلافتؓ کی ادائیگی اور شہادتؓ

خلافتِ عمر رضی اللہ عنہ کو دس سال گزر گئے' پورے دس سال' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ دن رات مصروف رہے' اپنی عقل' زبان اور ہاتھ ہر طرح سے کام میں مشغول رہے' راتوں میں ان کی نیند برائے نام تھی' کیونکہ انہیں مسلمانوں کے مسائل سے فرصت ہی نہ مل پاتی تھی' نہ ڈھنگ سے کھانا نہ پہننا اور نہ اور کوئی خواہش۔ کیونکہ ان کو یہ خدشہ تھا کہ کہیں مسلمانوں کا مال ضائع نہ ہو' یہ دس سال تک ہوتا رہا۔ ان دس سالوں میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس بڑے مقصد کی تکمیل فرمائی جو غارِ حراء سے شروع ہوا تھا' غور فرمایئے! وہ گنتی کے ۳۹/انسان جو دارارقم کے ایک گوشہ میں چھپے ہوئے تھے اب پورے حجاز و نجد' پورے جزیرۃ العرب' بلکہ شام' مصر' عراق و عجم کے حکمراں و فاتح بن کر ابھرے تھے' دارارقم ایک عظیم منظم حکومت کی شکل میں بدل چکا تھا جس کے سامنے روم وایران کی سلطنتیں گرد تھیں۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی ذمہ داری نبھادی' عظیم مشن کی تکمیل کر کے خلافتِ رسول کا حق ادا کر دیا' اب موقعہ آ چکا تھا کہ اس زبردست محنت اور انتھک کوشش کے بعد وہ کچھ آرام کر لیں' چین کا سانس لیں' زندگی کی لذتوں سے سیراب اور نعمتوں کے ذائقے سے لطف اندوز ہوں' چنانچہ انہوں نے آرام شروع کیا مگر یہ ابدی آرام تھا۔ سرزمین عرب پر یہ خبر زلزلہ و بجلی بن کر گری کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جیسا عظیم و تاریخ ساز مردِ آہن شہید کر دیا گیا۔ ایک کمینے

بدذات پارسی غلام ابولولؤ کے ناپاک ہاتھوں سے ایرانیوں کی یہ ذلیل پالیسی پوری ہوئی اور عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی ان کی زندگی میں صرف ایک ہی آرزو وتمنا تھی' وہ یہ کہ ان کی آخری آرامگاہ حجرۂ عائشہ میں' روضۃ الرسول کے پاس ہو اور وہ اگلی دنیا میں بھی اپنے انہیں دونوں ساتھیوں کے ساتھ رہیں جن سے انہیں بے پایاں محبت وتعلق اور لمحہ لمحہ کا ساتھ تھا اور جن کا انہیں ثالث کہا جاتا تھا' چنانچہ انہوں نے اپنے لخت جگر کو ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس جوارِ حبیب میں دفن ہونے کی اجازت لینے بھیجا اور بیٹے کو وصیت کی کہ یہ کہنا کہ عمر رضی اللہ عنہ آپ کو سلام کہتا ہے اور اپنے ساتھیوں کی صحبت میں دفن ہونے کی اجازت کا طلب گار ہے۔ پھر اپنے بیٹے سے کہا کہ میرا نام امیر المومنین کے حوالہ سے نہ لینا کیونکہ میں اب امیر المومنین نہ رہا۔ انہیں یہ خطرہ تھا کہ کہیں ان کا یہ منصب کسی ضرورت پر یا کسی فائدہ کے موقعہ پر استعمال نہ ہو' وہ ایسا کرنا ناجائز سمجھتے تھے حتیٰ کہ آخری وقت میں بھی یہی احساس انہیں دامن گیر رہا۔

بہر حال سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اجازت لینے گئے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ انگاروں پر پڑے ان کے واپس آنے کے منتظر رہے وہ ڈر رہے تھے کہ کہیں ان کی خواہش رد نہ کر دی جائے اور زندگی کی یہ آرزو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکے' چنانچہ جب سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے آنے کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا کہ اب مجھے سہارا دے کر اٹھاؤ۔

انقلابِ لیل ونہار دیکھئے' یہ وہی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہیں جن کی قوت و عزیمت ضرب المثل تھی جو گھوڑے کا ایک کان ایک ہاتھ سے اور دوسرا دوسرے ہاتھ سے پکڑ کر چھلانگ لگاتے اور اس کی پشت پر اس طرح چڑھ جاتے تھے'

جیسے وہ گھوڑے کی پشت پر پیدا ہی کیے گئے ہوں۔

یہ وہی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہیں جو موسم گرما کی سخت دھوپ اور لپٹ میں صحراء میں جا کر صدقہ میں آئے ہوئے دو بد کے اونٹوں کو پکڑ لائے تھے' یہ طاقتور' بہادر اور عظیم الشان انسان جن کی ہیبت کا سکہ جما ہوا تھا' اگر وہ اپنے ساتھیوں سے کسی ضرورت کے وقت بات کرتے تب بھی ان ساتھیوں پر ہیبت طاری ہو جاتی۔ یہ تھے اپنے زمانہ کے عمر رضی اللہ عنہ' مگر اب انقلاب روزگار ہی تھا کہ وہ خود بلا سہارے کے اٹھ نہیں سکتے تھے۔ یہ ہے خدائے برحق کی قدرت و صناعی کا کرشمہ ؎

انقلابات جہاں واعظ رب ہیں سن لو
ہر تغیر سے صدا آتی ہے **فافهم فافهم**

چنانچہ انہیں اُٹھایا گیا پھر جب انہیں اپنی آرزو و تمنا کے قبول ہونے کی اطلاع ملی تب ان کا دل خوشیوں سے معمور ہو گیا اور وہ بے اختیار کہہ پڑے الحمد للہ! مجھے اس آرامگاہ سے زیادہ کوئی چیز پسند نہ تھی۔ پھر وہ بستر پر لیٹ گئے اور روح قفسِ عنصری سے آزاد ہو گئی۔

چنانچہ اس چھوٹے سے بابرکت و مقدس کمرہ میں' جہاں بارہا سردار دو جہاں جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی الٰہی کا نزول ہوا تھا' جہاں دنیا کے وفود آتے اور جاتے' جہاں تعلیم و تربیت اور تزکیہ نفس کا کام ہر وقت ہوتا اور جہاں کی فضا ہر دم عبادت و تقویٰ سے لبریز رہتی تھی جہاں بارہا جبرئیل آئے اور جہاں تاریخ کے زریں و بے مثال صفحات تیار ہوئے' اور جہاں عظیم داستانیں ثبت ہیں' وہاں ایک چھوٹا سا گڈھا کھودا گیا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا انتظار شروع ہوا کہ وہ آ کر آرام کریں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تو آئے مگر اس آمد میں وہ شدت' طنطنہ اور کبر

وغضب نہ تھا جو اس وقت تھا جب وہ نبی اکرم کے قتل کے ناپاک ارادے لے کر نکلے تھے' بلکہ وہ تو اس حال میں آئے کہ ان کا جسدِ مبارک کپڑوں میں ڈھکا ہوا چارپائی پر رکھا ہوا تھا پھر انہیں اس آرامگاہ میں رکھ کر ہمیشہ کے لئے منوں مٹی تلے بند کر دیا گیا۔

وہاں اس مقدس آرامگاہ کے سامنے اس وقت سے لے کر اب تک مسلمان روئے زمین کے ہر ہر گوشہ سے آتے رہے ہیں اور آتے رہیں گے اور بڑے ہی ادب وسکون سے کہتے ہیں اور کہتے رہیں گے۔

السلام علیک یا رسول اللہ

السلام علیک یا أبا بکر

السلام علیک یا عمر

یہ مدحیں تا قیامت جاری رہیں گی' کبھی بند نہ ہوں گی ۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مشتاق بک کارنر
الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور